منزلِ عشق - پاکستان
(۱۹۴۷ء کی ہجرت کے دوران دل ہلا دینے والے سچے واقعات)
ڈاکٹر محمد رفیق
(تمغۂ امتیاز ملٹری)

منزلِ عشق ...... پاکستان

(۱۹۴۷ء کی ہجرت کے دوران دل ہلا دینے والے سچے واقعات)

ڈاکٹر محمد رفیق

تمغۂ امتیاز ملٹری

صریر پبلیکیشنز

Manzal e Ishq - Pakistan
by: Dr. Muhammad Rafiq
Sareer Publications. Lahore - Rawalpindi
Publication year: 2022, Pages 128
Research, Biography
ISBN: 978-969-738-075-6

نام کتاب	:	منزلِ عشق ۔ پاکستان
مصنف	:	ڈاکٹر محمد رفیق
ناشر	:	محمود ظفر اقبال ہاشمی
کمپوزنگ	:	میٹرکس کمپوزر، راولپنڈی
سرورق	:	طارق عزیز
سالِ اشاعت	:	2022ء
مطبع	:	فائن گراف پرنٹرز، لاہور
قیمت	:	-/600روپے

صریر پبلیکیشنز......لاہور، راولپنڈی (پاکستان)

پلازہ A-104، بیسمنٹ، سیکٹر C، کمرشل، بحریہ ٹاؤن، لاہور۔فون 042-37862105
پلازہ 3،4، سیکنڈ فلور، A-3، سوک سینٹر، فیز iv، بحریہ ٹاؤن، راولپنڈی۔فون:051-2711295

انتساب

میری یہ کتاب اس عظیم ہستی (فاطمہ عرف فطی) کے نام جس کی وجہ سے کلار خاندان کے غندیلہ سنگھ نے اسلام قبول کر کے سفرِحق کا آغاز کیا۔ دہلی کے عظیم صوفی بڑے شاہ صاحب کو میرا تہ دل سے سلام، جس نے کلار خاندان کے پہلے شخص کو دائرۂ اسلام میں داخل کر کے اس خاندان پر احسان عظیم کیا۔میری یہ کاوش میرے والدین (ابا جی اور ماں جی) کے نام جو خود ایک عظیم جدوجہدِ آزادی کے ہیرو تھے اور ان دونوں نے ایثار وقربانی کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ اس کتاب کو میں جدوجہدِ آزادی کے ہیرو چوہدری عطا محمد شہید (دادا جان) کے نام کرتا ہوں جنہوں نے اپنی شہادت سے کلار خاندان کے ہر فرد کو قیامت تک سرخرو کر دیا۔ میں عطا محمد کے تمام ساتھیوں (سکھوں اور رشتہ دار مسلمانوں) کو سلام پیش کرتا ہوں جنہوں نے ان کا حق کے سفر میں بھر پور ساتھ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص رحمتیں ان تمام لوگوں پر جنہوں نے پاکستان کی خاطر مشکلات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور سنتِ رسولؐ پر عمل پیرا ہو کر اور پاکستان کو اپنی منزل مقصود سمجھ کر ایک مقدس ہجرت کی۔

بیجا پور کی فطی سے جمال تک
ایک کلار خاندان کی داستان

﴿انڈین پنجاب سے پاکستانی پنجاب تک﴾

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
اِک آگ کا دریا ہے اور ڈُوب کے جانا ہے
(جگر مراد آبادی)

ترتیب

ابتدائیہ

یہ کتاب ایسے واقعات کا احاطہ کرتی ہے جن کے بارے میں ہماری نوجوان نسل شاید بہت کم جانتی ہے مگر اس میں ان کا قصور کم ہے کیونکہ ہمارے لکھاری اور محقق اس طرح کے واقعات کو اپنی تحریروں کا حصہ نہیں بنا سکے۔ اس کتاب میں ایک خاندان کے اسلام قبول کرنے سے لے کر حصولِ منزل تک ایک مسلسل جدوجہد کا سفر اور دورانِ ہجرت تکالیف کا تفصیلی بیان ہے۔ اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ان واقعات کا احاطہ کرتا ہے جو ہجرت کے سفر کے دوران مسلمان قافلوں پر گزرے۔ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد ایک خاندان کے کٹھن مراحل سے گزرنے کے واقعات کا بھی تفصیلی ذکر ہے۔ مختصر یہ کہ خاندان کے ہر فرد کی بے مثال قربانیوں کا بطریقِ احسن ذکر کیا گیا۔

جن لوگوں نے پاکستان بنتے دیکھا اور خود ان حالات کا مقابلہ کیا وہ لوگ شاید اب ہمارے درمیان بہت کم ہیں اور امکانات یہی ہیں کہ ان کی قربانیوں کو بھلا دیا جائے گا۔ اس موضوع پر لکھی جانے والی اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ میرے بزرگوں کی بے لوث قربانیاں اور وطن سے محبت کی یادیں تاریخ کا حصہ بن سکیں

اور ہماری آئندہ نسلیں ہمارے گمنام ہیروز کے کارنامے پڑھ کر ان کو خراج تحسین پیش کر سکیں۔ ایسی تحریریں ہماری نئی نسل کے دلوں میں جذبہ حب الوطنی اور پاکستان سے دلی محبت پیدا کرنے کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اسلام اور پاکستان سے محبت وہ جذبہ جنوں ہے جو ہم سب کے لیے امید اور یقین کا صراطِ مستقیم ہے۔ اللہ اس جذبے کو ہر پاکستانی کے دل میں ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

اس کتاب میں ایسے کرداروں کا تذکرہ ہے جنہوں نے آزاد ملک پاکستان کو اپنی منزل جانتے ہوئے تمام تر مشکلات کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ فاطمہ عرف فطی، چوہدری عطا محمد، چوہدری جمال الدین اور اور راجن بی بی کے کردار ایک رول ماڈل کے طور پر ہماری نوجوان نسل کے سامنے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد رفیق

اسلام آباد

فروری ۲۰۲۲ء

کتاب کے عنوان کی وجہ تسمیہ

اپنے وطن اور قبیلے سے انسان کی محبت ایک فطری عمل ہے۔اپنے آبائی گھر، دوست رشتے دار اور پیارے لوگوں سے جدا ہونا انتہائی مشکل فیصلہ ہے۔ ایک عظیم ہستی (جس کا نام فاطمہ عرف فطی تھا) نے اپنے ایمان کی طاقت سے ایک ایسی عظیم الشان جدوجہد کا آغاز کیا، جس کے نتیجے میں ایک مسلمان خاندان وجود میں آیا۔ بیجا پور کے ایک کلار خاندان کے سربراہ چوہدری عطا محمد کلار کا مثالی کردار پاکستان سے بے پناہ محبت کا مظہر تھا۔ قائداعظم سے ملاقات کے بعد چوہدری عطا محمد نے اپنی منزل مقصود کا تعین کرلیا تھا۔ ان کو اپنی منزل پاک سرزمین سے دِلی عشق تھا۔ پاکستان فاطمہ عرف فطی اوران کی آنے والی نسلوں کے لیے ایک عشق تھا اور آخر کار یہی عشق کلار خاندان کی منزل مراد بنا۔اپنی منزل مراد پاکستان سے سچا پیار اور عشق اس خاندان کی رگوں میں خون کی طرح شامل تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ اسی جذبے کی عکاسی اس کتاب کے عنوان ''منزلِ عشق...... پاکستان'' میں جھلکتا ہے۔

اعتراف اور اظہارِ تشکر

یہ میری اخلاقی ذمہ داری ہے کہ میں ان تمام لوگوں کو خراج تحسین پیش کروں جنہوں نے اس کتاب کی تکمیل میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس سلسلہ میں اپنے عظیم والدین کا سب سے زیادہ مشکور ہوں ، جنہوں نے اپنی زندگی کی آپ بیتیاں مجھے کئی بار سنائیں اور خاندان کے باقی بزرگوں نے تصدیق کرتے ہوئے ان واقعات کو بارہا مختلف لوگوں کو بتایا۔ میں بڑے شاہ صاحب کا مرہون منت ہوں ،جنہوں نے اسلام کی روشنی سے کلار خاندان کو راہ حق پر گامزن کیا۔ میرے سمیت میرے خاندان کا ہر شخص فاطمہ عرف فطی کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے جس نے اپنے ایمان کی طاقت سے کلار خاندان کو اللہ کی راہ دکھائی۔ اس عظیم اعزاز پر اللہ کا جتنا بھی شکر کروں کم ہے کہ میں راہِ حق کے شہید چوہدری عطا محمد کا پوتا ہوں، ان کی شخصیت سے میں ہمیشہ بے حد متاثر رہا ہوں اور ان کی خاندان اور پاکستان کے لیے قربانیاں اس کتاب کو لکھنے کا سب سے بڑا محرک ثابت ہوئیں ۔ میں چوہدری عطا محمد کلار کو خصوصی سلیوٹ پیش کرتا ہوں۔ میں اپنے چچاؤں، ماموں، پھوپھیوں (خصوصاً میری پھوپھی فاطمہ عرف رلی) اور خاندان کے دیگر بزرگوں کا بے حد مشکور ہوں کہ انہوں

نے مجھے گراں قدر معلومات فراہم کیں جو اس کتاب کے لیے بہت ضروری تھیں۔

میں اپنی فیملی کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے مجھے اس کتاب کو مکمل کرنے کے لیے مجھے وقت نکالنے میں معاونت کی۔ کتاب کی تحریر کے دوران میری زوجہ (شاہینہ رفیق) نے اردو کے چند مشکل الفاظ کے استعمال اور چناؤ میں میری معاونت کی۔ میں اپنی پوری فیملی کا مشکور ہوں۔ اس کے علاوہ میں اپنے ان تمام دوستوں کا مشکور ہوں جنہوں نے اس کتاب لکھنے کے لیے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔

اور میں خصوصی طور پر بلوندر سنگھ (بلو) اور گوپندر سنگھ (گوپی) (ان کا ذکر کتاب کے اندر بھی موجود ہے۔ان سے میری ملاقات امریکہ میں ہوئی تھی) کا مشکور ہوں جنہوں نے میرے خاندان اور بیجا پور کے بارے میں بہت اہم معلومات فراہم کیں۔ ان معلومات کے بغیر شاید بہت سے حقائق اس کتاب کا حصہ نہ بنتے۔ بلو اور گوپی کا بہت بہت شکریہ۔

بہت سے اور لوگوں نے میری معاونت کی ان سب کا میں تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میرے دوست احباب جب بھی مجھ سے میرے خاندان کے بارے میں سنتے ہیں ہمیشہ بہت تعریف اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ میں ان سب دوستوں کا مشکور ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

کارِ فرماں محرکات

میں (ڈاکٹر محمد رفیق) بچپن سے اپنے بزرگوں خصوصاً والدین ماموں چچاؤں اور دیگر لوگوں سے جب بھی ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہندو پاکستان کے واقعات اور اس دوران ان پر گزرے ناقابلِ یقین اور دل ہلا دینے والے سچے واقعاتِ سنتا تو مجھ پر ہمیشہ ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور ساتھ ساتھ روحانی طور پر بے انتہاء فخر اور اطمینان قلبِ محسوس ہوتا کہ میرا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جس نے تحریک پاکستان میں شہادتوں سمیت بے شمار قربانیاں دیں۔ انہوں نے خوشحال ہنستے بستے بڑی زرخیز اور وسیع زمینیں اور دیگر جائیدادیں چھوڑ کر سنت رسولِ کریمؐ پر عمل کرتے ہوئے ہجرت کے مشکل ترین مراحل سے گزر کر اسلام کے نام پر بننے والی ریاست اسلامی جمہوریہ پاکستان آنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۶ جولائی ۱۹۹۹ء کو جب میرے ابا جی کا انتقال ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنے عظیم انسان تھے۔ اس وقت سے میری خواہش تھی کہ میں ان تمام حقائق کو قلم بند کروں تا کہ میری آئندہ نسلیں بھی وہ فخر کر سکیں جو میرا سرمایہ حیات ہے۔

۲۰۱۵ء میں جب اپنی پی ایچ ڈی مکمل کرنے امریکہ گیا تو اسی دوران نیویارک میں میری ملاقات ایک انڈین سکھ سے ہوئی جو ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ اس سے دوران سفر بات چیت ہوئی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کا تعلق ضلع لدھیانہ

انڈین پنجاب سے ہے۔ میں نے لدھیانہ ضلع کے کچھ علاقوں کے نام لیے تو وہ حیران ہوا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ مجھے اتنی معلومات اس علاقے کی کیسے حاصل ہوئی۔ میں نے بتایا کہ میرے والدین اور دیگر خاندانی بزرگ لدھیانہ کے علاقہ بیجا پور، اکلاھا، اکلاہی، کھنہ اور دیگر قریبی علاقہ جات سے ہجرت کر کے (تقسیم ہند کے دوران) پاکستان آئے۔ بلوندر سنگھ نے مزید سوالات کیے اور ہم نے ایک دوسرے کے موبائل نمبر لیے اور واپس اپنی اپنی جگہ چلے گئے۔ بلوندر سنگھ (بلو) ستمبر ۲۰۱۵ء کے وسط میں واشنگٹن ڈی سی آیا اور ہم نے ایک کافی شاپ میں طویل ۸ گھنٹے گپ شپ لگائی۔ اس دوران اس نے بتایا کہ میری فیملی کے بزرگ جو بیجا پور میں رہتے تھے وہ آپ کے بزرگوں کو بہت اچھی طرح جانتے ہوں گے۔اس نے مزید بتایا کہ ان کے ایک تایا جان ہیں جو ورجینیا میں رہتے ہیں وہ بھی بہت اچھی طرح آپ کے بزرگوں کو جانتے ہیں۔ دو دن بعد میں اور بلوندر اس کے تایا گوپی (گوپندر سنگھ) کو ملنے گئے۔

گوپندر نے بتایا کہ وہ ۱۷ سال کا تھا جب پاکستان الگ ملک بنا۔ وہ اور اس کا خاندان بیجا پور گاؤں میں رہتے تھے۔ چوہدری عطرا (میرے دادا چوہدری عطا محمد عرف عطرا کلار جٹ) اور میرے والد (رنجیت سنگھ) آپس میں قریبی رشتہ دار اور بہت اچھے دوست تھے۔ چوہدری عطرا کے دادا مسلمان ہو گئے تھے وہ میرے پردادا کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ میرے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ ”بزرگو! تسی تے میرے رشتے دار ہو“۔ گوپی بولے ”پکی گل آ بھتیجے تھوڈے والد میرے وڈے بھرا ورگا سی۔“ میں ہمیشہ اونو بھا جی ای کہندا سی۔ اوہ میرے نالوں عمر وچ تقریباً ۱۸ سال وڈے اور میری وڈی بھین تے جمال“ (میرے ابا جی چوہدری جمال الدین) اکو سال وچ جمے سی“

اس کے بعد بھی ایک بار گوپندر سنگھ سے ملاقات ہوئی اس نے ویڈیو کال کے لیے اپنی بہو کو کہا اور کہا کہ پورا گاؤں ویڈیو کال پر دکھاؤ۔ میں ویڈیو کال پر پورا علاقہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی بہت ساری جگہوں کو پہچان بھی گیا۔

بلوندر کے والد مہندر سنگھ خالصتان تحریک کے اہم ترین لیڈر تھے اور اسی تحریک میں انڈین فوج نے اس کو گولی کا نشانہ بنایا۔ان کے انتقال کے بعد ان کے خاندان کے قریبی لوگ امریکہ منتقل ہو گئے۔

اس کے بعد میں نے اپنے خاندان کے بزرگوں اور کلار جٹ قوم کے بارے تحقیق کو مزید وقت دینا شروع کیا۔

سب سے زیادہ سنجیدہ اور اہم وجہ ان سچے واقعات کو قلمبند کرنے کی میری اپنے والدین سے عشق اور بے انتہا محبت ہے۔

میں ان کی قربانیوں کو اپنی آئندہ نسلوں کے لیے بھی اسی طرح فخر اور اطمینانِ قلب کا ذریعۂ بنانا چاہتا ہوں جس طرح میں اس خاندان کا فرزند ہونے کو اپنی خوش بختی، فخر اور زندگی کا سب سے بڑا ذریعہ اطمینان قلب سمجھتا ہوں۔ مجھے امید کامل ہے کہ انشاء اللہ اس تحریر کو پڑھنے والا ہر قاری میرے بزرگوں کے کردار اور قربانیوں کو ضرور سراہے گا اور ان کو اچھے لفظوں سے اپنی دعاؤں میں یاد کرے گا۔ ہمارا خاندان پاکستان بننے سے ابھی تک ایک مضبوط خاندان بننے کی جدو جہد کر رہا ہے۔ میرے سوا کوئی اور فرد اچھی تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔اللہ نے مجھے موقعہ دیا اور تعلیمی منزلیں طے کرتا گیا۔شاید یہ ذمہ داری میری ہی بنتی تھی کہ میں اپنے بزرگوں کی عظیم الشان تاریخ کے کچھ پہلو دنیا کو ضرور بتا سکوں۔ مجھے یقین ہے کے میری اس کاوش سے میرے ابا جی، ماں جی دادا جان دادی جان اور باقی بزرگوں کی روح کو تسکین پہنچے گی۔ میرے خاندان

میں آج تک کوئی یہ کاوش نہیں کر سکا۔ یہ فریضہ اللہ نے شاید مجھ سے ہی سر انجام دلوانا تھا۔ سب قارئین سے گزارش ہے کہ میرے اور میرے بزرگوں کے لیے دعا ضرور کر دیں۔

❁❁❁
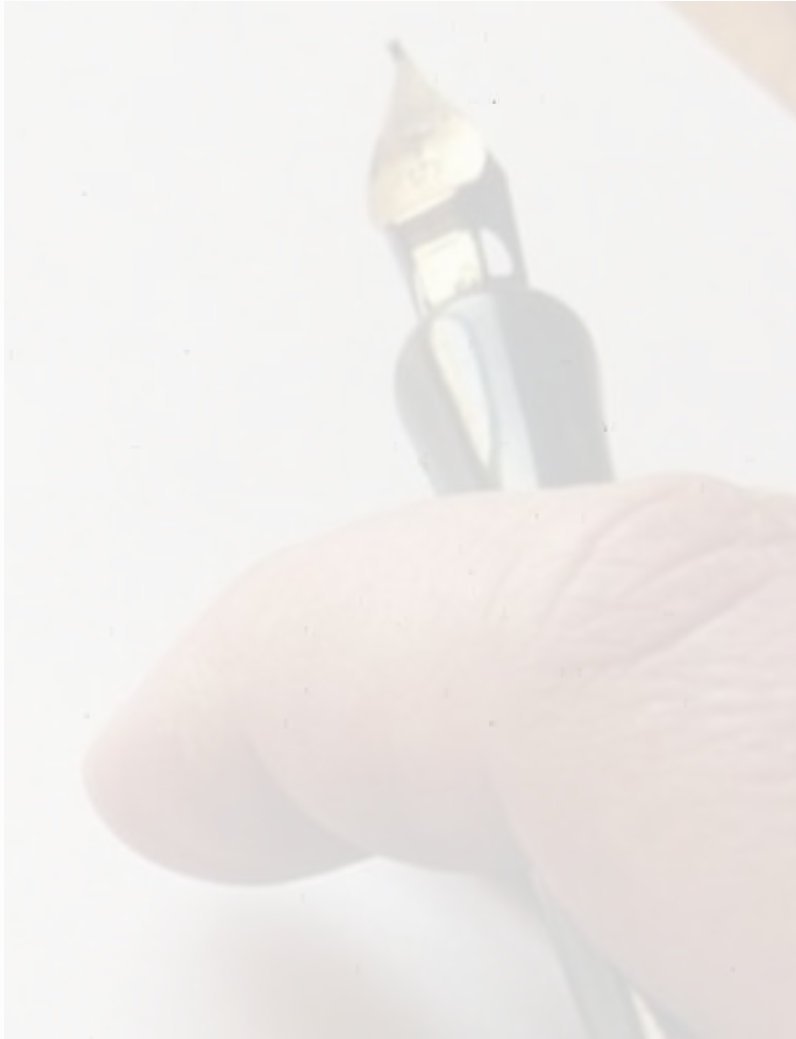
کلار خاندان

کلار (کلار یا کلیر ایک ہی لفظ کی ادائیگی کے دو انداز) جاٹ (جٹ) خاندان کی گوت (سب کاسٹ) ہے۔ کلار خاندان انڈین پنجاب میں زیادہ تر لدھیانہ، گرداسپور، امرتسر، چنڈی گڑھ، ہوشیار پور اور چند دیگر علاقوں میں آباد ہیں، تحقیق کے مطابق ابھی تک بھی کلار قوم کی واضح اکثریت سکھ مذہب اور انڈین پنجاب سے منسلک ہے۔ کلار شروع میں مدھیا پردیش کے ضلع رتلام اور دھاڑہ میں رہتے تھے۔

مغل دور حکومت میں آہستہ آہستہ پنجاب میں آباد ہو گئے اور کھیتی باڑی کو اپنا بنیادی ذریعۂ معاش بنایا۔ کبڈی اور کشتی کے کھیلوں کے لیے کلار خاندان بہت مشہور تھا۔ سکھ جٹوں کی بہت سی گوتیں (سب کاسٹس) مسلمان جٹوں میں اتنی ہی مقبول ہیں جن میں چیمہ، چٹھہ، رندھاوا، باجوہ، ڈھلوں، کاہلوں، سندھوں، ورک، تارڑ، بندیشہ اور چند اور بھی مشہور ہیں۔ کلار جٹ چونکہ بہت کم مسلمان ہوئے زیادہ تر ابھی بھی سکھ ہیں۔ اس لیے پاکستان میں کلار جٹ بہت ہی کم ہیں۔ میری تحقیق کے مطابق پاکستان بننے سے کئی سال قبل چند کلار خاندان فیصل آباد اور چند دیگر علاقوں میں آ کر

آباد ہو گئے تھے۔ اور یہ لوگ بہت فائدے میں رہے کیونکہ ان لوگوں کو یہاں زمینیں پاکستان بننے سے کئی سال پہلے ہی برطانوی حکومت سے الاٹ ہوگئیں۔ پاکستان بنتے ہی کچھ کلار خاندان انڈین پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور روزی روٹی کی تلاش میں مختلف مقامات پر آباد ہو گئے۔ کسی ایک جگہ اکٹھے نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان میں کلار خاندان اب تک گمنام ہے۔ اب تک بھی پورے پاکستان میں چند کلار خاندان ہیں۔

میرے دادا چوہدری عطا محمد بیجا پور تحصیل کھنہ ضلع لدھیانہ کے ایک مشہور اور بڑے زمیندار تھے۔ وہ ۱۷۳۴ ایکڑ زمین کے اکلوتے مالک تھے۔ قدرت نے ایک کٹھن ترین آزمائش اس خاندان کے مقدر میں لکھی تھی۔ چوہدری عطا محمد کی اولاد انتہائی کسمپرسی، بے یارومددگار اور غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئی۔ چوہدری عطا محمد کی اولاد غیرتِ ایمانی، جذبہ حب الوطنی اور خاندانی وقار لے کر پاکستان آ گئی۔

بیجا کے کلار خاندان کی شہرت

کلار جٹ (بیجا پور کے سکھ جاٹ) ضلع لدھیانہ پنجاب کے بہت مضبوط اور جانے پہچانے زمیندار (لینڈ لارڑز) تھے۔ اپنے وعدوں کی پاسداری کرنے اور دوستی نبھانے میں پنجاب بھر میں مشہور تھے، لوگ اس خاندان کی اعلیٰ نسلی کی مثالیں دے کر لوگوں سے لین دین اور رشتے ناطے استوار کرتے تھے۔ لدھیانہ کے لوگ اگر کسی جرم میں پکڑے جاتے تو انگریز جج اور سرکاری اہلکار کلار خاندان کے بزرگوں کی ضمانت پر رہائی دیتے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ یہ خاندان ضمانت دیئے گئے شخص (اگر وہ غریب ہو) کی طرف سے اس کا قرض وغیرہ خود ادا کر دیتے۔ بابا گرونانک کے نظریے کے مطابق یہ خاندان مسلمان صوفیاء اور اولیاء کی بہت عزت واحترام کرتے تھے۔ بابا فرید الدین گنج شکر اور نظام الدین اولیاء کے ساتھ خصوصی عقیدت رکھتے تھے۔ اس کلار خاندان کے لوگ اکثر اولیاء کرام کی درگاہوں پر حاضری بھی دیتے۔ اس لحاظ سے کلار خاندان خود سکھ ہونے کے باوجود مسلمانوں کی بہت عزت کرتے تھے۔ یہ خاندان سخاوت میں بھی بہت اچھی شہرت رکھتا تھا۔ بیجا پور میں ضرورت مند اس خاندان سے ہی اپنی ضرورت کی اشیاء اناج اور مویشیوں کے لیے چارہ وغیرہ لیتے تھے۔ کلار خاندان

جاٹوں کے باقی خاندانوں کی نسبت زیادہ سادہ ،صاف گو اور سخی شمار ہوتا تھا۔ کلار خاندان کی فصلیں مال مویشی اور شیشم کے درخت پورے پنجاب میں سب سے نمایاں اور خوبصورت ہوتے تھے۔ بیجا کے کلار خاندان کی عورتیں بہت بہادر محنت کش اور سگھڑ ہوتی تھیں۔ مہمان نوازی میں اس خاندان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ چوہدری عطا محمد اسی خاندان کے سپوت تھے اور ان میں خاندانی مثبت روایات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ وہ ایک عظیم خاندان کے عظیم وارث تھے۔ ایک عظیم انسان جس کی نسل کو اس پر ہمیشہ فخر رہے گا۔

بیجا پور کا مختصر تعارف

بیجا پور تحصیل کھنہ ضلع لدھیانہ انڈین پنجاب کا ایک چھوٹا سا خوبصورت گاؤں ہے، اس کی آبادی بہت کم ہے۔ بیجا اور بیجا پور دو الگ الگ گاؤں ہیں ان کے درمیان میں فاصلہ تقریباً ۵ کلومیٹر ہے۔ دونوں گاؤں آپس میں مشترک ہیں دونوں کے زمینداروں کی زمینیں دونوں آبادیوں میں ہیں۔ دونوں گاؤں کو ملا کر آبادی تقریباً ۴ ہزار کے قریب ہے۔ جب پاکستان بنا تو یہ آبادی ۸۰۰ کے قریب تھی۔ بیجا اور بیجا پور کی کل زمین تقریباً دس ہزار ایکڑ ہوگی بیجا پور کھنہ کے جنوب مغرب اور لدھیانہ کے جنوب مشرق میں ہے۔ کھنہ سے بیجا پور کا فاصلہ تقریباً ۱۰ کلومیٹر اور لدھیانہ سے ۱۸ کلومیٹر ہے۔ بیجا پور سے لدھیانہ اور گنڈا سنگھ تک مشرق سے مغرب کی جانب ایک سیدھی لائن بنتی ہے۔ بیجا پور سے راستے اور سڑکیں تمام بڑے شہروں کو آپس میں ملاتی ہیں۔ بیجا کے اردگرد کے مشہور گاؤں اکلاھا، اکلاھی، ملیر کوٹلہ، چکوہی، کوٹلہ ڈھاک، بابامنشد جی، رولڑا، گردوارہ ڈیرہ صاحب، چیمہ، مہندر پور مجری، موگا، سیدھوان بیٹ، دھرم کوٹ، جگران، اور نانو وال ہیں۔ بیجا سے پاکستان کا بارڈر تقریباً ۶۵ کلومیٹر دور ہے۔ بیجا کے گاؤں کی زمینیں بہت زرخیز اور درخت قدآور اور سایہ دار مشہور ہیں۔ بیجا پور انڈین پنجاب کی ثقافت، فلموں اور ڈراموں میں اکثر سنا اور پڑھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے بیجا پور انڈین پنجاب کے چند مشہور علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔

❀❀❀

پہلا باب

چوہدری عطا محمد کا پوتا اور چوہدری جمال الدین کلار کا چھوٹا بیٹا محمد رفیق (مصنف)

پاکستان بننے سے پہلے چوہدری عطا محمد کے زیادہ تر رشتہ داروں
کی رہائش ان نشان زدہ قصبوں میں تھی۔
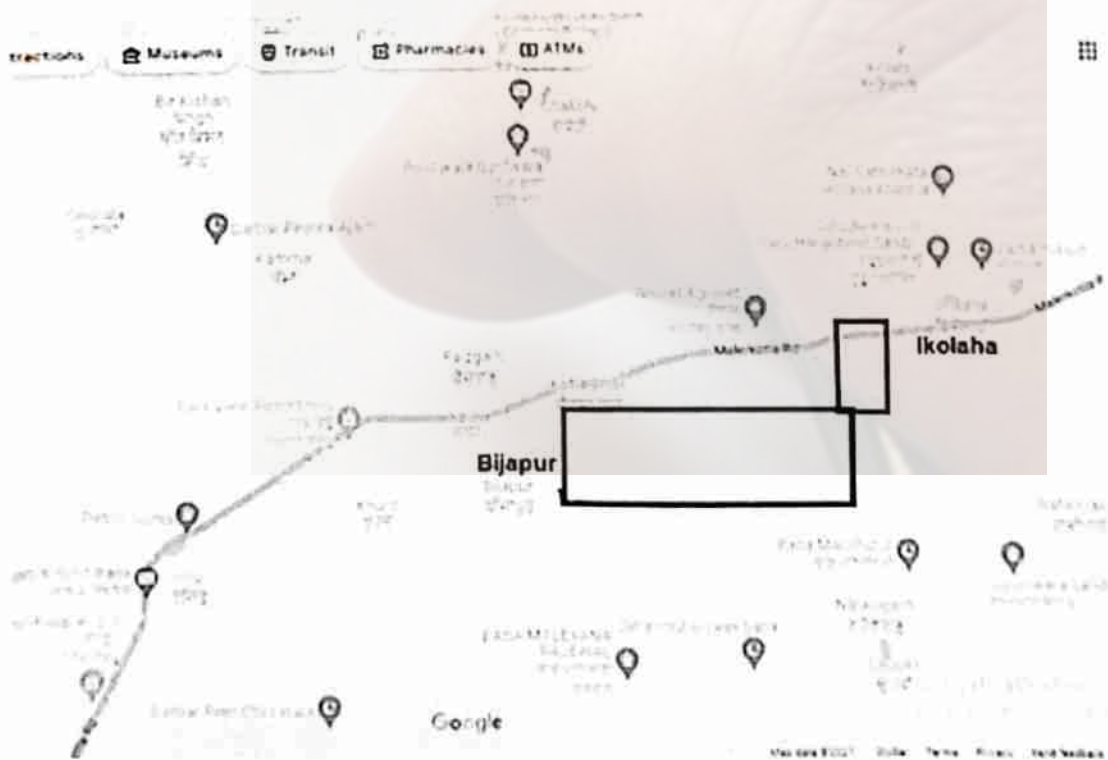
چوہدری عطا محمد کلار کی وراثتی زمین بیجا پور اور اکلاھا کے درمیان

چوہدری جمال الدین کلار اور راجن بی بی کے ہاں ۱۲ دسمبر ۱۹۶۸ء کو سب سے چھوٹا بیٹا محمد رفیق پیدا ہوا۔ اس وقت چوہدری جمال الدین کی عمر تقریباً ۶۳ برس اور راجن بی بی ۵۴ برس کی تھیں (ایک سال بعد سب سے چھوٹی بیٹی رضیہ بی بی پیدا ہوئی)۔ چوہدری جمال الدین اور راجن بی بی کے دو پوتے (محمد صدیق کے بیٹے عبدالغفار اور عبدالطیف) اور ایک نواسی (صدیقاں کی بیٹی پروین) اپنے چھوٹے بیٹے محمد رفیق اور چھوٹی بیٹی رضیہ بی بی سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ جب میں پیدا ہوا تو راجن بی بی (میری ماں جی) مجھے لوگوں سے شرم کے مارے چھپاتی پھرتی تھی۔

پیر سید رحیم اللہ شاہ صاحب اس وقت زندہ تھے انہوں نے میرے کان میں اذان دی اور نام بھی انہوں نے ہی رکھا۔ میں چھ ماہ کا تھا تو سخت بیمار ہو گیا اور سانس آنا بند ہو گیا۔ بے ہوشی کی حالت میں چوہدری جمال مجھے پیر صاحب کے پاس لائے۔ پیر سید رحیم اللہ شاہ صاحب نے دم کیا، اللہ سے رو رو کر دعا کی اور جمال الدین سے کہا کہ اس بچے کی زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے، اللہ سے دعا کی ہے اللہ اس کو صحت عطا کریں گے۔ اگر یہ بچ گیا تو اس کے مقدر میں اللہ نے بہت زیادہ علم رکھا ہے۔ اللہ نے اس بچے کی جان بخش دی۔ پرائمری میں نہ صرف اپنے گاؤں سے پہلی پوزیشن حاصل کی بلکہ پوری تحصیل میں سب سے زیادہ نمبر لیے۔ مجھے بچپن سے ہی کھیلنے، شرارتیں کرنے کا شوق تھا اور پڑھائی میں سب سے آگے ہوتا تھا۔ میٹرک گورنمنٹ

ہائی سکول چک ۲۳۷ ج۔ب لنگرانہ سے کیا اور سکول میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ایف اے کی تعلیم گورنمنٹ اسلامیہ کالج چنیوٹ اور جامعہ کالج محمدی شریف سے حاصل کی۔ ایف اے میں بھی نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ اس دوران میں نے کھیلوں میں بہت نام کمایا۔ کبڈی، ہینڈ بال، کرکٹ اور والی بال بہت اچھا کھیلتا تھا۔ میٹرک سے لے کر بی اے تک اتھلیٹکس میں کالج، ضلع، صوبہ اور قومی سطح کے بے شمار انعامات حاصل کیے۔ اتھلیٹکس کی نیشنل اکیڈمی میں بھی حصہ لیا۔

اس کے علاوہ میں نے نیشنل گیمز میں تین مرتبہ اور ایک مرتبہ جنوبی ایشیاء کے مقابلوں میں شرکت کی دو بار آل پاکستان انٹر کالجز کوئز مقابلوں میں حصہ لیا اور پہلی اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔ نیلام گھر اور طارق عزیز شو میں بھی چار بار گیا اور کئی انعامات جیتے۔ فرسٹ ائیر سے لے کر بی اے کرنے تک ٹیوشن بھی پڑھایا اور لائف انشورنس میں بطور سیلز ریپ اور سیلز آفیسر پارٹ ٹائم کام بھی کیا۔ صوفیانہ کلام عشق کی حد تک پسند ہیں اس کے علاوہ غالب، اقبال، فراز، احمد ندیم قاسمی اور قمر جلالوی کی شاعری بہت پسند ہیں۔ اپنے کالج کے زمانے میں مَیں نے بیت بازی میں بھی کئی مقابلے جیتے۔ بی اے کے بعد سی ایس ایس کا امتحان دیا اور تمام مضامین میں کامیابی حاصل کی مگر فائنل میرٹ میں نام نہیں آیا۔ کچھ عرصہ سٹیٹ بنک میں ملازمت کی۔ آرمی کمیشن کے لیے پہلے ۱۹۸۸ء کے لیے کامیاب ہو گیا مگر پی ایم اے نہ جا سکا۔ ۱۹۹۰ء میں دوبارہ آئی ایس ایس بی میں کامیابی کے بعد پی ایم اے میں شمولیت اختیار کی، اکتوبر ۱۹۹۲ء میں کمیشن حاصل کیا۔

اپنی تیس سالہ آرمی سروس کے دوران سیاچین، لاہور سیالکوٹ بارڈر، بلوچستان، وزیرستان سمیت بہت سی مشکل ذمہ داریاں بطریق احسن ادا کیں۔ اس

کے ساتھ اپنی تعلیمی اور تحقیقاتی استطاعت میں اضافہ کرتے رہے۔ پی ایم اے جانے سے پہلے بی اے کیا ہوا تھا لیکن پی ایم اے میں دوبارہ بی اے کیا۔ مشکل ترین جگہ لمبے عرصہ کے لیے پوسٹنگ کی وجہ سے سٹاف کالج نہ کر سکا۔ ۱۹۹۹ء میں بلوچستان یونیورسٹی سے اسلامک سٹڈیز میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ ۲۰۰۱ء میں پوسٹ گریجویٹ عربیک لینگویج کورس الاظہر یونیورسٹی کے زیر اہتمام دعوہ اکیڈمی اسلام آباد سے کیا۔ ۲۰۰۴ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ہسٹری میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ ۲۰۰۶ء میں آئی ٹی کورس انفارمیٹکس سنگاپور سے کیا۔ ۲۰۰۸ء میں ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز ڈگری حاصل کی۔ ۲۰۱۲ء میں میڈیا سائنسز میں ایم فل کیا۔ ۲۰۱۷ء میں پی ایچ ڈی (ڈاکٹریٹ) کی ڈگری نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی اسلام آباد سے مکمل کی۔ پی ایچ ڈی ریسرچ کے لیے نیشنل سکالرشپ ملا اور ۲۰۱۵ء اور ۲۰۱۶ء میں جارج ٹاؤن یونیورسٹی واشنگٹن ڈی سی میں بطور سینئر ریسرچ فوکل پرسن یادگار وقت گزارا اور ریسرچ کے اعلیٰ ترین مدارج سیکھنے اور پڑھانے کا موقعہ ملا۔

اس کے علاوہ اندرون ملک اور بیرون ملک سے اہم ترین پیشہ ورانہ کورسز جس میں کمیونیکیشن انسٹرکٹر کورس، کاؤنٹر انسر جنسی کورس، سائیکالوجیکل آپریشن کورس اور میڈیا اینڈ ٹیررزم کورس مکمل کرنے کا موقعہ ملا۔ اس کے ساتھ ساتھ تحریر، تحقیق اور تجزیہ نگاری کا وسیع تجربہ بھی حاصل کر رکھا ہے۔ قومی اور بین الاقوامی سیاست، قومی مفاد، ملکی مسائل کا حل، میڈیا مینجمنٹ اور میڈیا تحریک، انفارمیشن آپریشن اور نیشنل سیکیورٹی پر خصوصی عبور حاصل ہے۔ آج کل قومی سطح پر میڈیا اور جیو پولیٹکس کے تجزیے اور تحقیق سے منسلک ہیں اور اپنی پانچ سے زیادہ تحقیقی پبلی کیشن پر مصروف عمل ہیں۔

❀❀❀
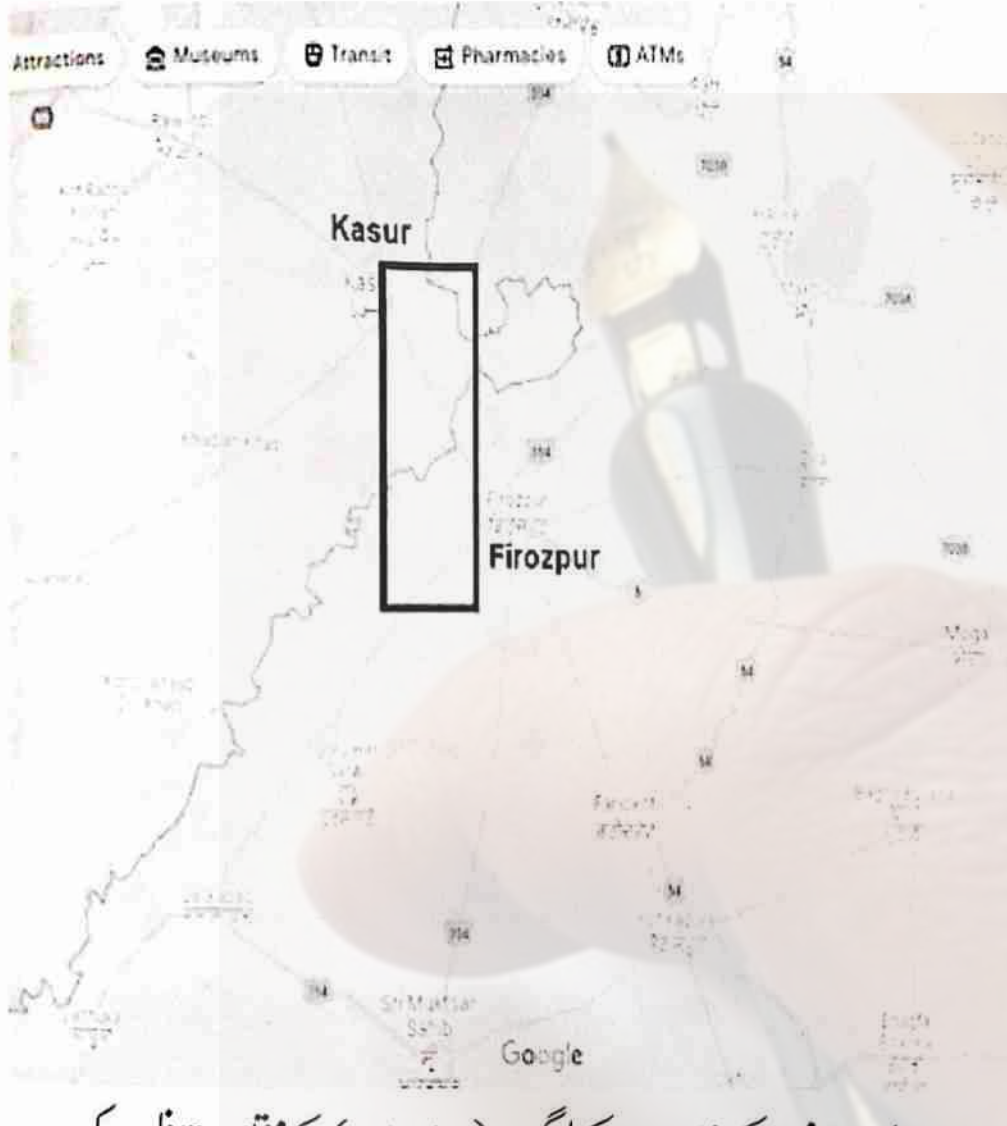
چوہدری عطا محمد کے خاندان کے لوگوں (مہاجرین) کے مختلف قافلوں کی بارڈر پار کرنے کی قصور اور فیروز پور کی درمیانی جگہ

دوسرا باب

فاطمہ بی بی المعروف فَطّیِ

روشنی کی پہلی کرن

ALL INDIA
RADIO
RADIO
PAKISTAN
INDIA
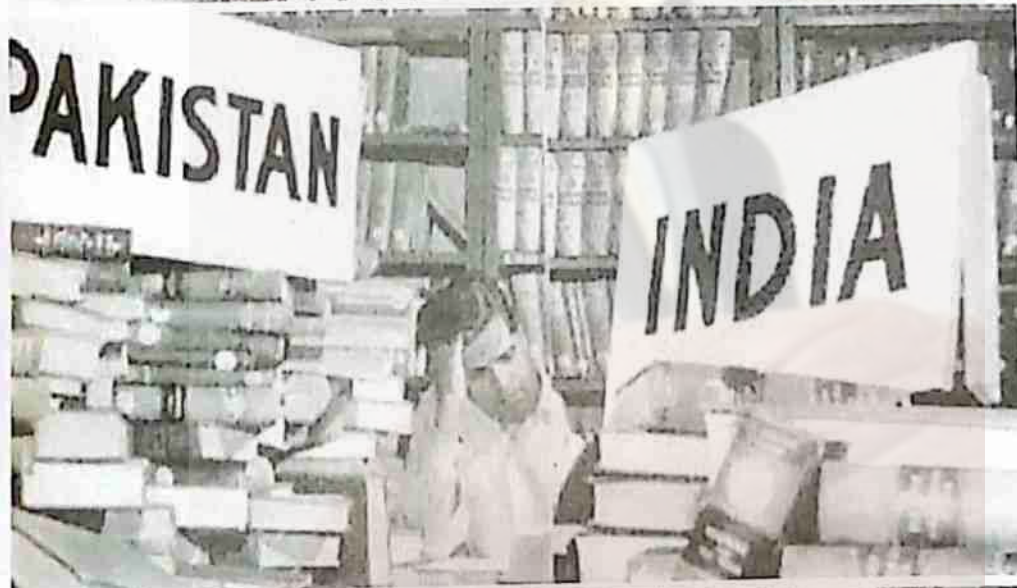
فاطمہ بی بی المعروف فطی ایمان کی روشنی کا ایک سرچشمہ تھا، جس نے اپنی نور کی روحانیت سے ایک شخص کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کے سفر پر گامزن کر دیا۔ اس شخص سے وہ خاندان بنا جس کے مقدر میں ایک کٹھن لیکن انتہائی بابرکت سفر لکھا تھا اور ایک خوش قسمت خاندان وہ سفر طے کر کے منزلِ مقصود پر پہنچا۔اس منزل مقصود کا نام مملکتِ خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔اور یہی اس کلار خاندان کے لیے منزلِ عشق بنا۔

فطی دہلی کے ایک مغل خاندان کی پڑھی لکھی اور حافظہ قرآن صوم وصلوٰۃ کی پابند لڑکی تھی۔ یہ غالباً ۱۸۶۰ء کا واقعہ ہے جب فاطمہ (فطی) کی عمر ۱۹ سال تھی۔اس کے والدین فوت ہو چکے تھے اس کے چچا اس کی شادی اپنے ان پڑھ اور شرابی بیٹے سے کروانے لگے، تو فاطمہ (فطی) نے انکار کر دیا۔ جب اس کے چچا اور بھائی اس کی شادی زبردستی کرنے لگے تو فاطمہ اپنے والدمحترم کے مرشد (بڑے شاہ صاحب کے نام سے مشہور تھے اُن کا اصل نام معلوم نہیں ہو سکا، چوہدری جمال الدین اور دیگر بزرگوں کے مطابق رحیم اللہ شاہ صاحب بھی ان کو بڑے شاہ صاحب کہ کے مخاطب کرتے تھے) کے پاس پہنچ گئی اور اپنی داستان سنائی۔ بڑے شاہ صاحب نے فاطمہ کو ضلع لدھیانہ کے گاؤں بیجا پور اپنے ایک معتمد خاص سکھ جاٹ ہر بھجن سنگھ کے پاس بھجوا دیا۔ ہر بھجن نے پیر صاحب کی ہدایت کے مطابق فاطمہ کو پناہ دی، جہاں وہ الگ

کمرے میں رہتے ہوئے اپنے مذہبی فرائض سکون اور آزادی سے ادا کر سکتی تھی۔

کچھ مہینوں بعد فاطمہ واپس دہلی بڑے شاہ صاحب کے پاس آئی اور شکایت کی کہ ہربھجن کا بیٹا غندیلہ سنگھ اس سے شادی کرنے کو کہہ رہا تھا، چند دنوں بعد غندیلہ سنگھ فاطمہ کو تلاش کرتے کرتے دہلی بڑے شاہ صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ پیر صاحب نے سمجھایا کہ مسلمان لڑکی کسی غیر مسلم سے شادی ہرگز نہیں کر سکتی۔ غندیلہ اپنی مرضی سے مسلمان ہو گیا اور پیر صاحب نے اس کا نام محمد علی رکھا (مگر عمر بھر لوگ اسے غندیلہ کے نام سے ہی جانتے اور پکارتے رہے) چھ ماہ تک غندیلہ نے پیر صاحب سے قرآن اور نماز کے علاوہ اسلام کی بنیادی تعلیم و تربیت بھی حاصل کی۔

غندیلہ تھوڑا کم پڑھا لکھا مگر بہت سمجھدار اور بہادر نوجوان تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے کبھی فاطمہ کو ملنے یا بلانے کی کوشش نہیں کی، پیر صاحب اس بات سے بہت خوش تھے۔ فاطمہ کو راضی کرنے کے بعد پیر صاحب نے ان دونوں کا نکاح کر دیا۔ ہربھجن سنگھ کو یہ سب بہت بُرا لگا اور پیر صاحب سے دونوں کی واپسی کا مطالبہ کیا، بڑے شاہ صاحب نے انکار کیا۔ ایک خونریزی سے بچنے کے لیے فاطمہ نے پیر صاحب کی مدد سے عدالت سے رجوع کیا۔ فاطمہ اور غندیلہ کی حفاظت کے لیے برطانوی عدالت نے دو فوجی اہلکار تعینات کر رکھے تھے۔ غندیلہ کے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ بڑا بھائی جو غیر شادی شدہ تھا فوت ہو گیا۔ چھوٹا بھائی بھی ذہنی معذور تھا اور جلدی فوت ہو گیا۔ چھوٹی بہن شادی کے بعد بمبئی اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تھی۔ اس طرح اپنے والد کی جائیداد کا ہربھجن اکلوتا وارث اس خاندان کا واحد مسلمان غندیلہ (محمد علی) تھا۔

۱۸۶۳ء میں غندیلہ اور فاطمہ کے ہاں اللہ نے بیٹا عطا کیا۔ دہلی والے پیر صاحب اپنے بیوی اور ایک بیٹے سمیت غندیلہ کے گھر مستقل رہائش پذیر تھے۔ پیر

صاحب نے نوزائیدہ بچے کے کان میں اذان دی اور اس کا نام نور محمد رکھا۔(نور محمد) غندیلہ (محمد علی) کا بڑا بیٹا تھا۔غندیلہ (محمد علی) کی ایک بیٹی تھی جس کا نام کبریٰ تھا۔

۱۸۸۵ء میں جب غندیلہ کا انتقال ہوا تو اس کے چچا اور اس کی اولاد نے باقی سکھوں کی مدد سے اس کی لاش اپنے قبضے میں لے لی اور اعلان کروا دیا کہ غندیلہ سکھ ہی تھا اس کو سکھوں کی رسم کے مطابق جلایا جائے گا۔اس طرح سے وہ ساری زمین اپنے قبضے میں کرنا چاہتے تھے۔غندیلہ کی بیوہ فاطمہ عرف فطی فوراً عدالت پہنچ گئی اور عدالت نے ایک بار پھر انصاف کرتے ہوئے غندیلہ کی تدفین اسلامی رسومات کے مطابق ادا کروائی۔تدفین کے بعد بھی غندیلہ کی قبر مبارک پر برطانوی فوج کے سپاہی پہرا دیتے تھے۔

غندیلہ کی وفات سے چند ماہ قبل ان کے بیٹے نور محمد (عرف روڈو جٹ) کی شادی مریم بی بی سے ہو چکی تھی۔۱۸۸۶ء میں بڑے شاہ صاحب انتقال فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، بڑے شاہ صاحب ایک بہت صوفی اور ولی اللہ تھے۔اپنے ایمان اور یقین کی روشنی سے گلشن اسلام کو جلا بخشنے والی فاطمہ (فطی) ۱۹۰۱ء میں اپنے خالقِ حقیقی کو جاملیں۔

ایمان کا پہلا پودا ہمارے خاندان میں جس عظیم ہستی نے لگایا وہ فاطمہ ہی تھی۔غندیلہ سے لے کر مجھ تک اور آگے آنے والی ہمارے کلار خاندان کی قیامت تک کی نسلیں فاطمہ کی احسان مند رہیں گی۔وہ بیجا کے کلار خاندان کو اسلام کی روشنی سے منور کرنے والی اللہ کی نیک عورت تھی۔اللہ تعالیٰ ان کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔آمین۔

❀❀❀
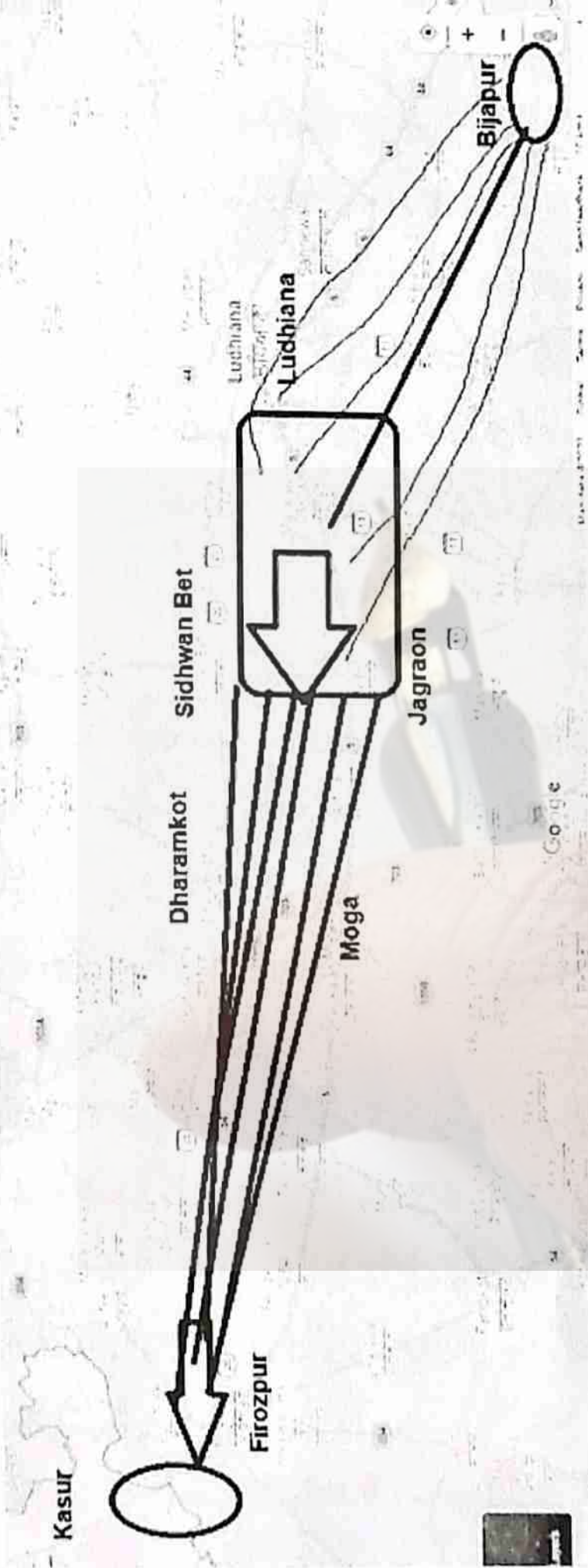
چوہدری عطا محمد کے خاندان (مہاجرین) کے مختلف قافلوں کے بیجا پور سے بارڈر پار کرنے تک کے راستے۔

تیسرا باب

روشنی کا سفر جاری، فطی کے لگائے ہوئے پودے
(خاندان) کا مختصر تعارف

LIFE
LIFE
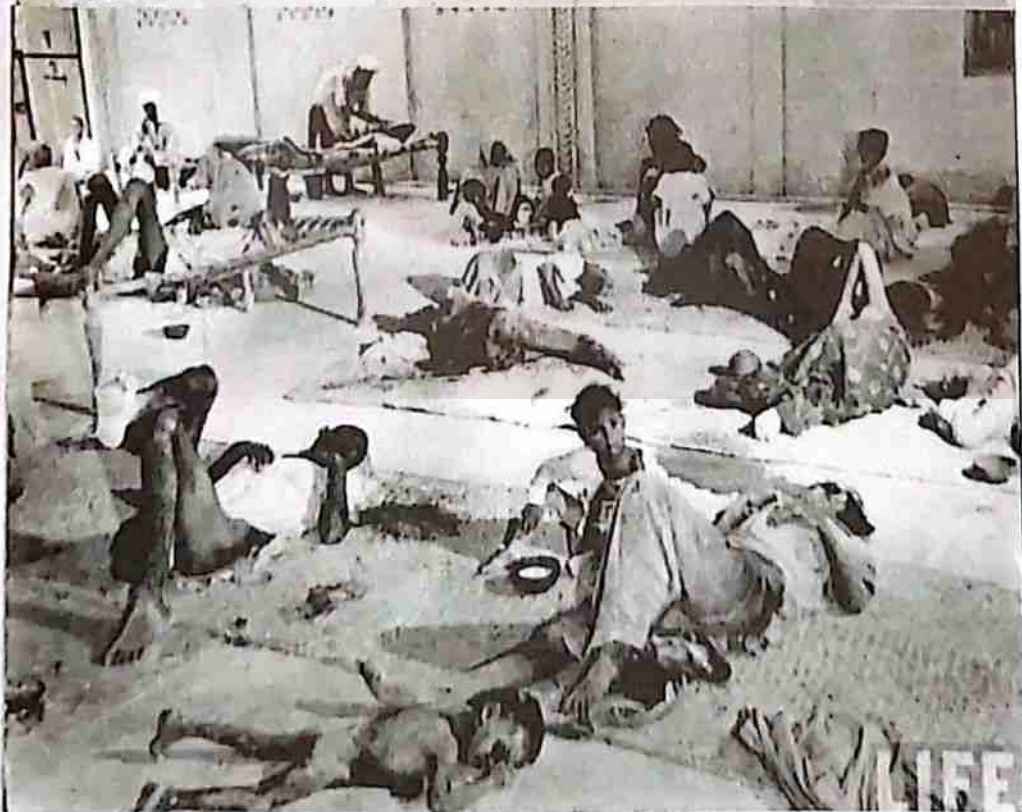
بڑے شاہ صاحب کے انتقال کے وقت ان کے چھوٹے بیٹے سید رحیم اللہ ۳ سال کے تھے۔ جو ۲۰ سال کی عمر میں پیر طریقت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں عطا محمد پیدا ہوئے۔ عطا محمد نے ۱۹۰۳ء میں رحیم اللہ شاہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔

چوہدری عطا محمد (میرے دادا) کے ایک ہی چھوٹے بھائی تھے جن کا نام دین محمد (عرف رُلیا) تھا وہ درویش اور مجذوب تھے۔ رُلیا زیادہ وقت کھیتوں میں گزارتا اور ادھر ہی سو جاتا تھا۔ وہ سبزیاں اُگانے کا ماہر تھا۔ کدو کے بیج لگاتے ہوئے بتا دیتا کہ یہ کدو گول ہوگا یا لمبا ہوگا، چھوٹا ہوگا یا بڑا ہوگا۔ پورے علاقے میں مشہور تھا کہ جہاں وہ سبزی لگائے گا سبزی بہت زیادہ ہوگی۔ ہر سال گرمیوں میں جب سخت گرمی پڑتی اور بارش نہ ہوتی تو سارے گاؤں والے اکٹھے ہو کر رُلیا کے پاس آتے اور اسے اشاروں سے بتاتے کہ اللہ سے بارش کی دعا کرے۔ رُلیا اکثر ان کی باتوں پر توجہ نہ دیتا۔ مگر کبھی وہ غور سے بات سنتا اور سخت گرمی میں جھومنا شروع کر دیتا۔ کافی دیر تک گول گھومتا رہتا پھر اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر دل میں کچھ بولتا رہتا۔ رُلیا سے ملنے والے عینی شاہدین کے مطابق اللہ رُلیا کی دعا قبول کرتا اور بارش ہو جاتی تھی۔ بیجا پور گاؤں کے لوگ پہلے سے ہی حلوہ اور گوشت پکا کر رکھتے تا کہ جب بارش ہو تو سب گاؤں والوں میں کھانا تقسیم کیا جائے۔ اس نے شادی نہیں کی تھی

اور ۱۹۳۷ء میں اس کا انتقال ہوگیا تھا۔ میرے دادا عطا محمد کی شادی ۱۹۱۳ء میں میری دادی زینب سے ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں میری بڑی پھوپھی فاطمہ عرف رلی پیدا ہوئی۔ فاطمہ کے ساتھ رلی کا اضافہ ان کے مجذوب چچا رُلیا کی نسبت سے منصوب کیا گیا۔ ۱۹۱۵ء کے آخر میں میرے ابا جی جمال الدین عرف جمالا جٹ پیدا ہوئے۔ میرے ۳ چچا جن کے نام کرم دین، نظام الدین اور امام الدین تھے جو بالترتیب ۱۹۱۷ء، ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ ۵ پھوپھیاں فاطمہ، شریفن، مالن، کرموں اور مجیدن بالترتیب ۱۹۱۴ء ۱۹۱۹ء، ۱۹۲۳ء، ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئیں۔

جمال الدین (میرے والد صاحب) کی شادی راجن بی بی (میری والدہ) سے ۱۹۳۷ء کے وسط میں ہوئی۔ میری ماں جی (راجن بی بی) ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والدین یعنی میرے نانا اور نانی مہی خان اور مریم بی بی اکلاھا گاؤں کے تھے جو کہ بیجا پور سے ۳ کلومیٹر دور تھا۔ نانا کے والد کا نام نور محمد اور والدہ کا نام مائی بصری تھا۔ میری والدہ کے والدین (مہی خان اور مریم بی بی) بھی بڑے شاہ صاحب کے ہاتھوں بیت کر کے مسلمان ہوئے تھے۔ اسی لیے میرے والد اور والدہ کے خاندان میں بہت گہرا تعلق تھا وہی تعلق رشتہ ازدواجگی میں بدل گیا۔

پاکستان بننے سے پہلے بیجا کا مسلمان کلار خاندان بہت مضبوط ہو چکا تھا اور مسلمان کلار خاندان چوہدری عطا محمد کی سربراہی میں سکھ خاندانوں سے زیادہ بڑا زمیندار خاندان تھے۔ چونکہ دونوں (مسلمان اور سکھ) آپس میں رشتے دار تھے دونوں کے درمیان ابتدائی دور میں دشمنی کے بعد صلح کی کوششوں سے آپس میں صلح ہو گئی۔ سکھ خاندان چوہدری عطا محمد کو اس کے قانونی حصہ کے مطابق زمین دینے کے لیے مان گئے۔ اس طرح چوہدری عطا محمد کے حصے میں ۱۳۷۴ ایکڑ زمین آ گئی یہ زمین ۳ دیہاتوں بیجا، بیجا پور اور اکلاھا میں تھی۔ اب دونوں فریقین صلح اور امن سے

رہنے لگے۔

جب پاکستان بننے کا وقت قریب تھا تو اس وقت میری دادی زینب فوت ہو چکی تھی۔ باقی خاندان میں دادا (عطا محمد) ان کے ۴ بیٹے، ۵ بیٹیاں، دادی کے رشتے داروں کے علاوہ عطا محمد کے بڑے بیٹے (جمال الدین۔ میرے والد محترم) اور بڑی بیٹی فاطمہ (میری پھوپھی) کی شادی ہو چکی تھی۔ جمال الدین کے ۲ بچے (محمد صدیق ۸ سال اور صدیقہ بی بی ۲ سال) کے تھے، تیسرا بچہ خدا بخش دوران ہجرت پیدا ہوا اور میری پھوپھی فاطمہ ان کے شوہر غلام محمد دونوں کے ۳ بیٹے عبدالعزیز، عمر دین اور گلزار احمد بالترتیب ۷، ۹ اور ۱۱ سال کے تھے ان کی ایک بیٹی رحموں بی بی ۱۰ سال کی تھی۔

اسی طرح سے ماں جی کے بڑے بھائی کرم بخش (میرے ماموں) کے اس وقت ۲ بیٹے رمضان (۸ سال) اور رحم دین (۴ سال) کے تھے۔ ماں جی کے دوسرے بھائی (میرے ماموں) کی شادی، میری پھوپھی مالن بی بی سے ہوئی تھی۔ میری خالہ دھرم بی بی کی شادی بھی ہو چکی تھی۔

المختصر میرے دادا چوہدری عطا محمد اپنے تمام رشتہ داروں کے سر پرست تھے۔ دادا، ان کی بہن، ۴ بیٹے، ۵ بیٹیاں، داماد، بہوئیں، سالے سالیاں اور بچوں سمیت کل زیر کفالت افراد ۵۱ تھے۔ یہ تمام افراد پر مشتمل لوگ چوہدری عطا محمد (عطرا جٹ) کی سربراہی میں بیجا، اکلاھا، اکلاھی اور نزدیکی آبادیوں میں مکین تھے۔ (سب گاؤں تحصیل کھنہ ضلع لدھیانہ میں چند میل کے اندر اندر تھے)۔

ان ۵۱ افراد کے علاوہ ۲۰۰ کے قریب سکھ جاٹ بھی دادا کے رشتہ دار تھے، اکثر کے ساتھ دادا کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ تمام لوگ میرے دادا چوہدری عطا محمد کی بے انتہاء عزت و احترام کرتے تھے۔ پورے پنجاب میں دادا کے خاندان کا شمار

چند بڑے زمیندار خاندانوں میں ہوتا تھا۔ اپنے ضلع میں وہ پنچائیت کے فیصلے کرتے اور ان کے فیصلوں کو قبول کیا جاتا تھا۔ چوہدری عطا محمد عرف عطرا ایک منصف اور رحم دل انسان تھے۔ چوہدری عطا محمد کا شمار انڈین پنجاب کے چند بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔
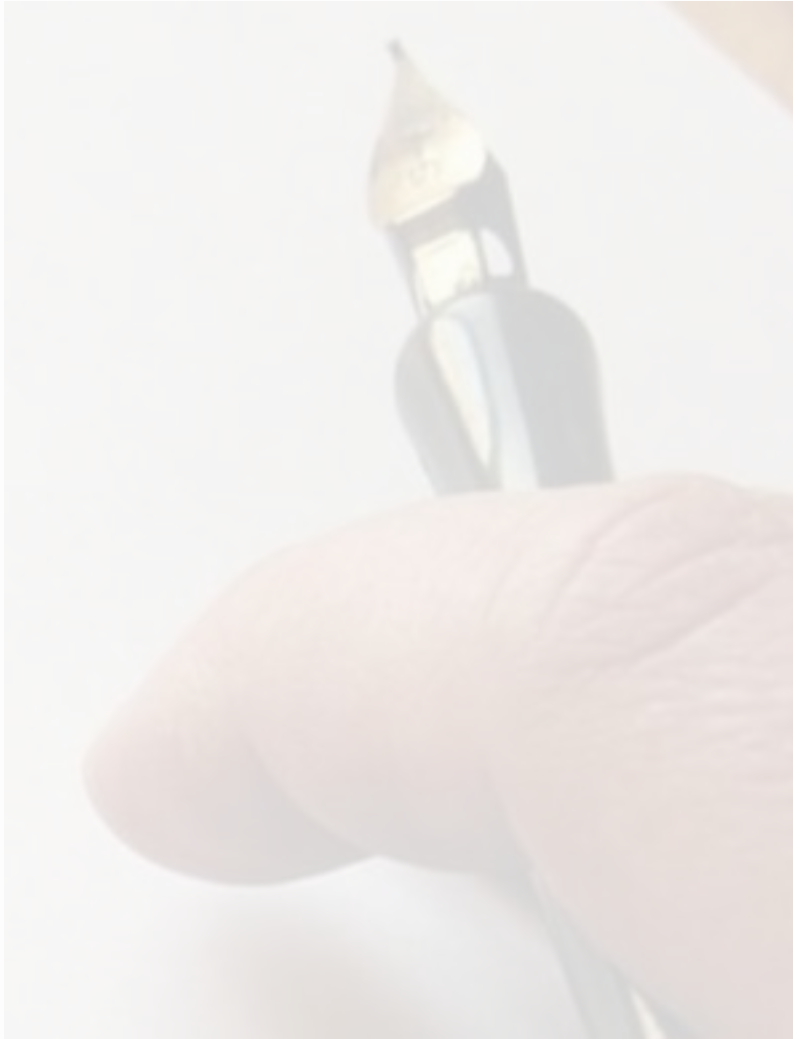
چوتھا باب

بے لوث قربانی، سخاوت اور آزمائش کا وقت

(آزادی کے قریب چوہدری عطا محمد

اور کلار خاندان کا کردار)

LIFE

۳ جون ۱۹۴۷ء کو منصوبہ تقسیمِ ہند منظور ہو گیا تو پنجاب کے لوگوں کو پہلی بار یقین ہوا کہ پاکستان ایک آزاد ملک بن جائے گا۔ اس سے پہلے پنجابی خصوصاً بیجا پور میں لوگ یہی سمجھتے تھے کہ یہ ناممکن ہے لوگ کیسے اپنا گھر بار، مال مویشی اور جائیدادیں چھوڑ کر ہجرت کر کے نئی منزلیں تلاش کریں گے۔

مگر ۳ جون کے بعد حالات اور سوچ اچانک بدل گئی۔ مشرقی پنجاب سکھوں کا گڑھ تھا۔ لوٹ مار اور ڈاکے اس علاقے میں کافی عام تھے۔ سکھوں کے ایسے ہی جتھوں نے موقعہ غنیمت جانتے ہوئے مسلمانوں کو لوٹنا اور مارنا شروع کر دیا۔ اس خونریزی اور ہوس میں وہ سکھ خاندان اور افراد بھی شامل ہو گئے جو اپنی شرافت اور انصاف کے لیے مشہور تھے۔ یہ ایک قیامت کا منظر تھا اور مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے لیے کڑی آزمائش کا وقت تھا۔ ہر کوئی اپنی زندگی بچانے کی فکر میں تھا۔

بیجا پور کے چوہدری عطا محمد اور اس کے خاندان والے شاید سب سے کم پریشان تھے۔ چوہدری عطا محمد سب گاؤں والوں کے لیے امیدوں کا مرکز اور مضبوط سہارا تھے۔ ان کے زیرِ سایہ سب گاؤں والے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔

سکھوں کی لوٹ مار کا سامنا کرنے کی سکت پنجاب کے مسلمانوں میں نہیں تھی۔ زیادہ تر مسلمان خاندان اپنی جان بچانے کی خاطر اپنے گھروں سے نکل کر چھپ چھپا کر زندگی اور موت کی کشمکش میں پاکستان آنے کی کوشش میں تھے، مگر ان کو

کسی نہ کسی کے سہارے کی ضرورت تھی۔ ان سارے حالات کے تناظر میں چوہدری عطا محمد بھی بہت پریشان تھے، مگر وہ اپنے خاندانی وقار اور اپنی صلاحیت کی وجہ سے ابھی تک سکھوں کے براہ راست مظالم سے بچے ہوئے تھے۔ چوہدری عطا اس بات سے بہت پریشان تھے کہ وہ پنجاب کے بے یارو مددگار مسلمانوں کو سکھوں اور ہندوں کے مظالم سے کیسے محفوظ رکھ سکیں۔ بیجا پور کے سکھ بھی چوہدری عطا محمد کی وجہ سے مسلمانوں کی لوٹ مار کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہ اس کا کوئی حل نکالنا چاہ رہے تھے۔ بیجا پور اور قریبی علاقہ کے سکھوں کا اکٹھ (پنچائیت) ہوا اور سب سکھ اکابرین نے فیصلہ کیا کہ وہ چوہدری عطا محمد اور اس کے زیر پناہ مسلمانوں کو کچھ نہیں کہیں گے (ان کے مال و جان کو نقصان نہیں پہنچائیں گے)، اس کے بدلے میں چوہدری عطا محمد سکھوں کے باقی علاقوں کے مسلمانوں پر حملے اور لوٹ مار پر سکھوں کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کریں گے۔ چوہدری عطا اس بات پر راضی نہ تھے وہ سب مسلمانوں کے بارے میں پریشان تھے۔قریبی مسلمان دوستوں کے سمجھانے پر وہ سکھوں سے معاہدہ کے لیے تیار ہو گئے۔ اس معاہدے سے بیجا پور اور قریبی علاقوں کے مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دوسرے علاقہ کے لٹے پٹے بے سہارا مسلمان چھپتے چھپاتے دادا (چوہدری عطا محمد) کے پاس پناہ گزین ہو گئے۔تقریباً ۱۵ ہزار کے قریب مجبور مسلمان چوہدری عطا محمد کے پاس آ گئے۔ عطا محمد نے اپنے گھر، زمین، اناج اور تمام فصلوں کو اپنے مسلمان مہمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ جون ۱۹۴۷ء کے وسط سے اگست کے وسط تک دو مہینے یہ لوگ حفاظت سے چوہدری عطا محمد کی پناہ میں رہے۔ اس دوران چوہدری عطا محمد نے انصارِ مدینہ کی یاد تازہ کر دی۔ اور اپنا مال و متاعِ بخوشی اپنے مسلمان بہن بھائیوں کے لیے پیش کر دیا۔ یہاں تک کہ دادا خود اور اس کے گھر کے لوگ بھوکے پیاسے رہے مگر مہمانوں کی ضروریات بطریقِ احسن پوری کیں۔ بے

لوٹ قربانی کا یہ جذبہ اللہ کی ذات نے چوہدری عطا محمد کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھر رکھا تھا۔ عطا محمد کا یہ جذبہ ان کی پختگیِ ایمان اور انسانیت سے بے پناہ محبت کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔ اس جذبہ ایثار کی مثال آج کے زمانے میں شاید نہ مل سکے۔ چوہدری عطا محمد ایک دریا دل عظیم انسان تھے۔ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مہمان نوازی کے دوران کبھی پریشان نہیں ہوئے۔

ان دو ماہ کے بعد چند ناخوشگوار واقعات نے دادا کو بہت پریشان کر دیا۔ امرتسر، گرداسپور، چندی گڑھ اور دیگر علاقوں کے سکھوں نے حملے کر کے دادا کے زیر پناہ مسلمانوں کو لوٹنا شروع کر دیا، اور مسلمانوں کا کافی نقصان کیا، دادا کو بہت زیادہ فکر لاحق ہوئی کہ اپنے بھائیوں کی حفاظت کیسے یقینی بنائی جائے۔ مقامی سکھ جاٹ جو کہ دادا کے ساتھ مخلص تو تھے مگر اب ان سکھ جتھوں کو روک نہیں سکتے تھے۔ چوہدری عطا کے پاس ٹھہرے سب مسلمان چوہدری عطا کو ہی اپنا مسیحا اور نجات دہندہ سمجھتے تھے اور ان کے فیصلے کے منتظر تھے۔ پیر صاحب اور باقی بزرگوں نے دادا کو مشورہ دیا کہ اب حالات قابو سے باہر ہو گئے ہیں بہتر یہی ہے کہ ان مسلمانوں کو بحفاظت پاکستان بھجوایا جائے۔ میرے دادا چوہدری عطا محمد نے پیر صاحب (سید رحیم اللہ شاہ صاحب) اور باقی بزرگوں کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا اور مسلمانوں کو پاکستان بھیجنا شروع کر دیا۔ دادا کے انتہائی قریب اور بہت ہی گہرے دو دوست علم دین (علما لوہار حافظ قرآن اور بہادر انسان تھا) اور بنسی سنگھ (بنسی سنگھ عمر میں دادا سے بہت چھوٹا تھا اور دادا کا جگری دوست، رازدار اور رشتہ دار تھا) تھا۔ دادا نے ان کے ذمے یہ اہم فریضہ لگایا کہ وہ اپنے لشکر تیار کریں اور مسلمانوں کو پاکستان پہنچائیں۔ اس کے بعد قیامت خیز واقعات پر مبنی قافلوں کا وہ سفر شروع ہوا جس نے ہجرتِ مدینہ کی یاد تازہ کر دی اور یہ ایک قیامت صغریٰ کا منظر بھی تھا۔ اس ساری جدوجہد میں چوہدری عطا

محمد کا کلیدی کردار رہا۔

یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ چوہدری عطا محمد اپنی نگرانی میں سارے معاملات کو دیکھتے تھے۔ سب سے مشورہ کرتے اور اللہ کو یاد کر کے اپنے منصوبہ کے مطابق مسلمانوں کی روانگی کا عمل شروع ہو جاتا۔ اس سارے منصوبے کے لیے چوہدری عطا محمد اپنی کھڑی فصلوں کو بیچتے تھے اور مویشیوں کو بھی فروخت کرتے تا کہ مالی مشکلات کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اس مشکل وقت میں گاؤں کے سکھوں اور مسلمانوں نے چوہدری عطا محمد کا بہت ساتھ دیا۔ یہ کام آسان نہ تھا چوہدری عطا محمد نے ایک ماہر فوجی جرنیل کی طرح پورے آپریشن کی خود نگرانی کی۔ جس کی وجہ سے یہ آپریشن بہت کامیاب رہا۔ اگر چوہدری عطا محمد اس کام میں دیر کرتے تو شاید ہزاروں مسلمان اپنی زندگیاں کھو دیتے۔ اس لحاظ سے چوہدری عطا محمد ہزاروں مسلمان خاندانوں کے لیے ایک نجات دہندہ اور مسیحا ثابت ہوئے۔
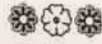
پانچواں باب

مہاجرین قافلوں کی روانگی۔ تلاش منزل میں پیش آنے والے اہم ترین حالات واقعات

LIFE
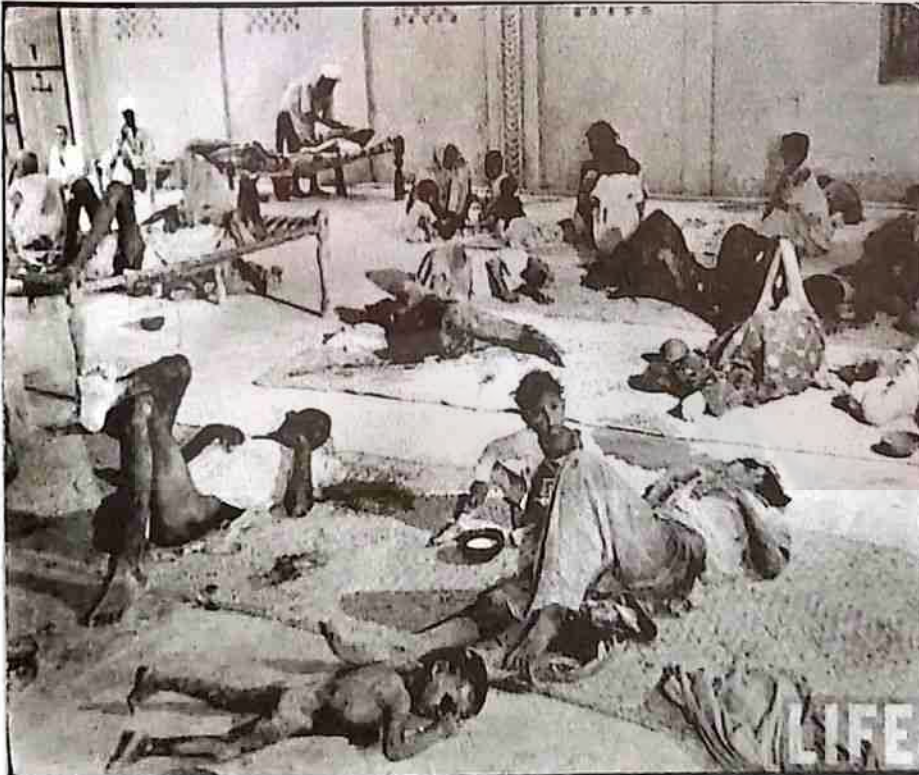
چوہدری عطا محمد کے طے کردہ منصوبہ کے مطابق سفر ہجرت کے لیے قافلوں کی تشکیل دی گئی۔ ۱۵ ہزار کے قریب مسلمانوں کو ۱۵۰ سے ۲۰۰ لوگوں کے گروپوں میں اس طرح بانٹا گیا کہ ہر گروپ میں ۱۵ سے ۲۰ جوانوں کا ایک لشکر ہوتا، ان کے کمانڈر نامزد ہوتے یہ مسلح افراد اپنے گروپ کی حفاظت کے لیے نیزے، کلہاڑیوں اور ڈنڈوں سے لیس ہوتے۔ چوہدری عطا محمد نے ایک عظیم جرنیل کی طرح سارے عمل کی خود نگرانی کی۔ ۲ سے ۳ گھنٹے بعد ایک قافلہ روانہ ہوتا چوہدری عطا محمد ان کو گڑ، بھنے ہوئے چنے اور مکئی کے بھنے ہوئے دانوں کے پیکٹ راستے میں کھانے کے لیے دیتے۔ یہ عمل ۱۵ سے ۲۰ دن جاری رہا۔ اس دوران ۲ ہزار سے زائد مسلمان سکھوں کے حملوں سے شہید ہوئے۔ بنسی سنگھ بھی بہادری سے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے مارا گیا۔ میری دلی دعائیں بنسی کے لیے اور مجھے یقین ہے اللہ اس کی اس عظیم الشان قربانی کا صلہ ضرور دے گا۔ اس بڑے، مقدس اور کامیاب ترین اپریشن کی وجہ سے ۱۳ ہزار سے ۱۴ ہزار کے درمیان مسلمان اپنی منزلِ مقصود پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اس عظیم ہجرت میں عطا محمد کی ذمہ داری والے پنجابی مسلمانوں سے ایک ہزار سے زیادہ لوگوں نے شہادت کا عظیم اعزاز حاصل کیا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

اس اہم ترین مرحلے کے بعد بیجا پور میں صرف دادا کے اپنے خاندان کے لوگ بشمول پیر صاحب اور علم دین اور چند قریبی دوست باقی رہ گئے۔ کل ملا کے ۶۰ کے قریب ساتھی اب بھی چوہدری عطا محمد کے پاس موجود تھے۔ چوہدری عطا محمد خاندانی وجاہت، بہادری، حوصلے اور دانائی کا پیکر تھے۔ ان مشکل مرحلے سے گزرتے گزرتے چند مہینوں میں چوہدری عطا محمد بیمار پڑ گئے اور کافی کمزور اور غریب ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی جسمانی، مالی اور ذہنی صلاحیتیں اپنے مسلمان بھائیوں پر صَرف کر دیں۔ اب ان کو خطرات نے پہلے سے زیادہ گھیر لیا اور پریشانیاں بڑھنے لگیں۔ بیجا پور کے زیادہ تر سکھ جو عطا محمد سے بہت پیار کرتے تھے نہیں چاہتے تھے کہ وہ اور اس کے خاندان کے لوگ انہیں چھوڑ کر پاکستان جائیں۔ مگر کچھ سکھ اندر سے ان کو بھجوانا چاہتے تھے اور جائیداد کو ہڑپ کرنا چاہتے تھے۔ چوہدری عطا محمد کو بھی اس بات کا اندازہ ان سکھوں کی مختلف قسم کی ریشہ دوانیوں سے ہو رہا تھا۔ اب چوہدری عطا محمد محبت اور نفرت کے درمیان ایک ایسے دوراہے پر کھڑے تھے جہاں سے اپنی منزل مقصود کا تعین کرنا آسان نہ تھا، مگر منزلِ عشق پاکستان ہی تھی۔

پیر صاحب نے ہر صورت عطا محمد کا ساتھ دینے کی یقین دہانی کروا دی جس سے ان کو بہت حوصلہ ملا۔ چوہدری عطا محمد پاکستان جانے کے لیے بے قرار ضرور تھے مگر انہوں نے آخری فیصلہ پیر صاحب پر چھوڑ دیا۔ پیر صاحب نے اپنا فیصلہ سنانے کے لیے ایک رات کی مہلت مانگی۔ پیر سید رحیم اللہ شاہ صاحب نے رات کو اللہ کے حضور رجوع کیا، استخارہ کیا اور دعائیں مانگیں۔ فجر کی نماز پڑھانے کے بعد چوہدری عطا محمد (میرے دادا جان) کی راہنمائی کی۔ پیر صاحب کے علاوہ بھی خاندان کے چند لوگوں کی رائے یہی تھی کہ پاکستان جانا ہی سب مسلمانوں کے لیے بہتر اور ضروری ہے۔ چوہدری عطا محمد نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کے ساتھی اور خاندان والے حق کے

راستے میں پورے خلوص سے ان کے ساتھ ہیں۔ اب چوہدری عطا محمد نے اگلے مرحلے کا منصوبہ بنانے کے لیے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور ماہر کمانڈر کی طرح منصوبہ بندی کی۔ اس منصوبہ کی ایک ایسی جہت تھی جس نے سب کو رُلا دیا۔ دادا کے منصوبہ کے مطابق ہر گروپ ۱۰ سے ۱۲ لوگوں پر مشتمل تھا اور کُل ۵ گروپ تھے۔ ان تمام گروپوں میں چوہدری عطا محمد کا نام نہیں تھا۔ سب کی پریشانی دیکھ کر عطا محمد نے بتایا کہ بیجا کے سکھ جاٹ جو ان سے بہت محبت کرتے ہیں، چاہتے ہیں کہ وہ مجھے (چوہدری عطا محمد کو) پورے اعزاز سے روانہ کریں گے اور خود بارڈر تک چھوڑ کر آئیں گے۔ اور ان کی خواہش ہے کہ وہ خود گنڈا سنگھ بارڈر تک ایک بگھی میں بڑے لشکر کے ساتھ چوہدری عطا محمد کو لے کر جائیں اور الوداع کر کے آئیں۔

چوہدری عطا محمد کی آنکھیں اپنوں کی محبت میں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ یہ فیصلہ سب کے لیے مشکل تھا۔ قیامت خیز منظر ہو گا جب چوہدری عطا محمد جیسے شفیق بزرگ کو خدا حافظ کہ کے اس کے ساتھی روانہ ہوئے ہوں گے۔ پیر سید رحیم اللہ شاہ صاحب چوہدری عطا محمد اور باقی خاندان سے اجازت لے کر اکیلے روانہ ہو گئے۔ سید رحیم اللہ شاہ صاحب کو ان کے ایک مرید نے باحفاظت پاکستان پہنچایا اور شروع میں وہ ساہیوال کے قریب کسی گاؤں میں رہے۔ چند ماہ بعد وہ تلاش کرتے کرتے عطا محمد کے بڑے بیٹے چوہدری جمال الدین کے پاس آ گئے۔ سید رحیم اللہ شاہ صاحب کو چوہدری عطا محمد کے شہید ہونے کی اطلاع مل چکی تھی۔ رحیم اللہ شاہ صاحب نے یہ خبر جب چوہدری جمال الدین کو سنائی تو ایک کہرام مچ گیا۔ چوہدری جمال الدین (میرے ابا جی) کا فخر ان کے والد چوہدری عطا محمد تھے۔ اس طرح اس مرحلے میں چوہدری عطا محمد کے ساتھیوں کے کل ۴ قافلے اپنی منزل مراد پاک سر زمین مملکت پاکستان کی طرف روانہ ہوئے۔

پہلا قافلہ

عطا محمد کی بہو راجن بی بی کے دو بھائی اور ایک بہن (میرے دونوں ماموں کرم بخش عرف کرما جٹ اور دھرم بخش عرف دھرما جٹ اور خالہ دھرم بی بی عرف دھرموں)، دادا کی چار بیٹیاں یعنی میری چار پھوپھیاں (فاطمہ، مالن، شریفین اور مجیدن) اور دیگر چھوٹے بڑے ملا کر بارہ لوگ قافلے کا حصہ تھے۔

دوسرا قافلہ

عطا محمد کی مرحومہ زوجہ (میری دادی زینب) کے رشتہ دار چھوٹے بڑے ملا کر بارہ لوگوں کا قافلہ تھا۔

تیسرا قافلہ

دادا کی مرحومہ بہن نوراں کے رشتہ دار اور دادا کی ایک بیٹی کرموں سمیت چھوٹے بڑے ملا کر ۱۲ لوگوں کا قافلہ تھا۔

چوتھا قافلہ

چوہدری عطا محمد کی بیٹی فاطمہ (میری پھوپھی) اس کا شوہر غلام محمد (غلام محمد اس وقت ۴۰ سال کا تھا، وہ برطانوی حکومت کا ریلوے کے محکمہ میں ملازم تھا اور خاندان کا واحد پڑھا لکھا شخص تھا)، بہو راجن بی بی (میری ماں جی، جن کو ساری اولاد بے بے جان کہہ کے مخاطب کرتے تھے، ماں جی میں نے کہنا شروع کیا) اور دیگر چھوٹے بڑے ملا کر ۱۲ لوگوں کا قافلہ تھا۔

پانچواں قافلہ

سب سے بڑا قافلہ جس میں دادا کے ۴ بیٹے (جمال الدین میرے ابا جی

ساری اولاد ان کو بھائی کہ کے مخاطب کرتی، پہلی دفعہ میں نے ابا جی کہنا شروع کیا) چچا کرم دین، نظام الدین اور امام الدین سمیت ۱۴ لوگوں کا قافلہ تھا۔

چھٹا اور آخری قافلہ

چوہدری عطا محمد (میرے دادا جان)،علم دین اور سکھوں کا ایک بڑا جتھہ (سکھوں نے دادا کو پروٹوکول کے ساتھ بارڈر پر الوداع کرنا تھا) پر مشتمل ایک عالی شان قافلہ جس کی جاہ وجلال رعب اور وقار دیدنی تھا۔قافلے کی تشکیل سے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی ملک کا سربراہ روانہ ہو رہا ہے۔

ان قافلوں کے اور حالات و واقعات کا ذکر آگے صفحات پر بیان کیا گیا ہے۔

❀❀❀

LIFE
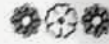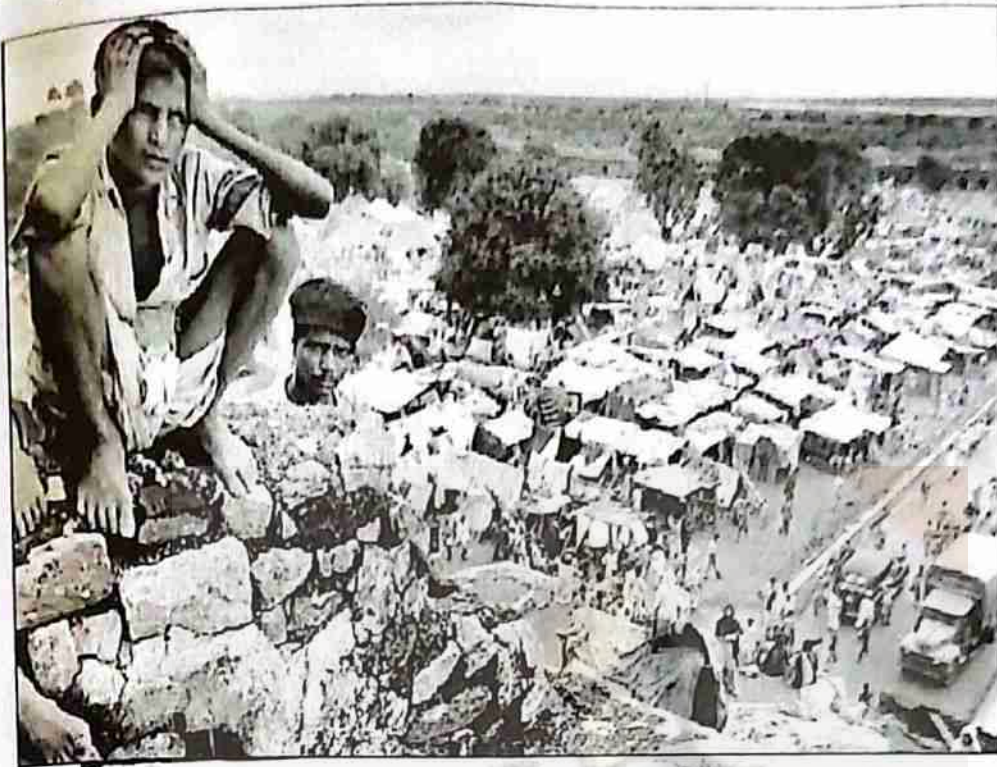
چھٹا باب

خفیہ قافلوں کی روانگی

دادا جان (چوہدری عطا محمد) کے پلان کے مطابق سارے قافلے سکھوں سے خفیہ نکالنے تھے۔ پہلے تین قافلے کافی حد تک رازداری سے روانہ ہو گئے۔ یہ تینوں قافلے ایک ہی وقت میں تین مختلف راستوں سے روانہ ہوئے۔ ایک گرداسپور سے آنے والے بڑے قافلے سے مل گیا۔ اس میں میرے دو ماموں کرم بخش اور دھرم بخش، ماموں کرم بخش کے تین بچے (رمضان، رحمدین اور عمری) اور خالہ (دھرموں) چار پھوپھیاں (جن میں سے ایک کرم بی بی تھی جس کو جب سکھوں نے اغوا کیا تو اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر جان دے دی) بھی تھیں۔ اس قافلے میں باقی تینوں پھوپھیاں پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔ اس قافلے پر ایک بڑا حملہ ہوا جس میں کافی مسلمان شہید ہو گئے اور ۱۰ کے قریب مسلمانوں کی جوان عورتیں سکھ حملہ آور اغوا کر کے لے گئے۔ اس قافلے کے چشم دید گواہ بتاتے ہیں کہ سکھ مسلمان عورتوں کی عزت سب کے سامنے لوٹ رہے تھے ان سے بھاگ کر تین عورتوں نے کنویں میں چھلانگ لگائی، جن میں ایک میری پھوپھی کرم بی بی بھی تھی۔ پاکستان پہنچ کر کافی عرصہ بعد یہ لوگ اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کو ملے۔ اللہ نے ان کو ان کی قربانیوں کے صلے میں دوبارہ زندگی شروع کرنے کا موقعہ دیا۔

دوسرے قافلے میں میری دادی کے رشتے دار اور کچھ اور لوگ تھے اس قافلے کا بعد میں بھی کوئی پتہ نہ چل سکا۔ کسی سکھ نے دادا کو بتایا تھا کہ اس سارے قافلے (تقریباً ۱۲ افراد) کو امرتسر کے سکھوں نے شہید کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ تمام

شہدا کی قربانی قبول فرمائے۔ آمین۔

اسی طرح تیسرا قافلہ میرے دادا کے بہنوئی اور اس کے بچوں سمیت ۱۲ لوگوں پر مشتمل تھا۔ ایک حملے میں ان میں سے سارے مرد بشمول دادا کے بہنوئی محرم علی شہید ہو گئے۔ کچھ زخمی عورتیں اور بچے کسی ویران گھر میں گھس گئے سکھوں نے دیکھ لیا اور اس گھر کو آگ لگا دی اس طرح یہ سب لوگ بھی اللہ کے راستے میں شہید ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

ان تین قافلوں کے بعد سکھوں نے سارے راستے بند کروا دیے تاکہ چوہدری عطا محمد اور اس کے خاندان کے لوگ بیجا پور سے نہ نکل سکیں اور وہ موقعہ کی تلاش میں تھے کہ بیجا پور آ کر مسلمانوں پر حملہ کیا جائے۔ مگر دادا نے حفاظتی انتظامات کیے ہوئے تھے اور بیجا پور کے سکھ بھی دادا کے ساتھ تھے۔

اب خفیہ قافلے نکالنا ممکن نہ رہا۔ اب دادا سمیت تقریباً ۲۵ مسلمان رشتہ دار بیجا میں رہ گئے تھے۔ دادا کو چلے جانے والے اور ابھی تک ان کے پاس رہنے والوں سب کی بہت فکر لاحق تھی۔ اب دادا کے منصوبہ کے مطابق آخری ۲ قافلے جانے تھے۔

اس تمام عمل کے دوران چوہدری عطا محمد اور اس کے وفادار ساتھیوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ قافلے میں جانے والے لوگوں کے لیے زادِراہ، راستے میں انتہائی ضرورت کے لیے سامان وغیرہ کا انتظام کیا گیا۔ ان قافلوں کو مضبوط بنانے کے لیے بھی ہر ممکن منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ سب سے بڑھ کہ چوہدری عطا محمد کے جذبے اور بہادری کو سلام جس نے بیجا پور اور پنجاب کے مسلمانوں کا اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر خیال رکھا۔ اللہ سے دعا ہے کہ تمام شہداءِ آزادی پاکستان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقام نصیب ہو۔

ساتواں باب

ماں جی اور پھوپھی فاطمہ والا قافلہ جرأت و ہمت کی بلند پایہ مثال
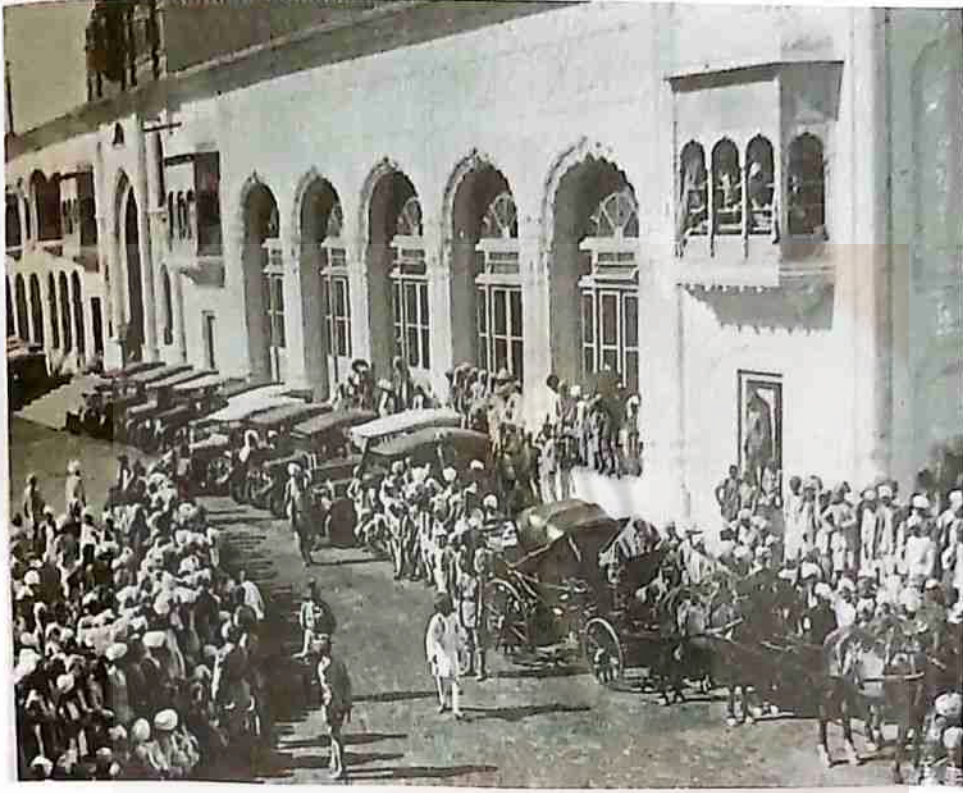
چوہدری عطا محمد کی بیٹی فاطمہ عرف رلی (میری پھوپھی) اس کا شوہر غلام محمد، بہوراجن بی بی اور دیگر چھوٹے بڑے ملا کر ۱۲ لوگوں کا قافلہ ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کو بیجا سے روانہ ہوا۔ غلام محمد اس قافلے کو لدھیانہ شہر سے آنے والے ایک اور قافلے میں ملا کر واپس اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ اب میری ماں جی، پھوپھی وغیرہ اس قافلے کے سربراہ کا حکم ماننے کے پابند تھے۔ ۱۳ اگست کی رات کو پھوپھی فاطمہ نے اپنے چوتھے بیٹے عمر خیام کو جنم دیا۔ ۳ بڑے بیٹے عمر دین، عزیز اور گلزار بھی ساتھ تھے یوں پھوپھی کے ۵ دن کے بیٹے عمر خیام سمیت ۴ بچے تھے۔ ان کی ایک بیٹی رحم بی بی عرف رحموں بیماری کی وجہ سے ساتھ نہیں آ سکی۔ میری ماں جی (راجن بی بی، عطا محمد کی بہو، ایک انتہائی بہادر، ہنس مکھ اور خدا ترس عورت ۲۱ سال کی تھی) کے ہاں تیسرا بچہ خدا بخش (میرا بھائی) ۱۴ اگست کو پیدا ہوا۔ قافلے کی روانی کے وقت خدا بخش ۴ دن کا تھا۔ خدا بخش سے بڑی بہن صدیقہ بی بی (میری سب سے بڑی بہن آپا صدیقاں) سوا سال کی تھی اور صدیقہ سے بڑے محمد صدیق (میرے سب سے بڑے بھائی صدیق) ۸ سال کے تھے۔ یوں ماں جی کے ساتھ ۳ بچے تھے۔ اس قافلے پر کئی بار سکھوں نے حملہ کیا مگر قافلے کے جوانوں نے بہادری سے مقابلہ کر کے ان کو واپس بھیجنے پر مجبور کر دیا۔ ۲۱ اگست کو یہ قافلہ ایک کماد کے کھیت میں چھپا ہوا تھا دن کے وقت سکھ لٹیروں کا جتھہ قریب سے گزر رہا تھا کہ اس قافلے میں شامل بچوں کے رونے

کی آواز سن کر سکھ جتھہ کماد کے اس کھیت میں داخل ہوا اور مسلمانوں کے اس قافلے کے ۱۰ لوگ شہید ہو گئے۔

جب جتھہ قتل و غارت کرنے کے بعد چلا گیا تو اس قافلے والوں نے سخت فیصلہ کیا کہ جن عورتوں کے پاس بچے ہیں وہ ساتھ اس صورت میں جا سکتی ہیں کہ وہ اپنے شیر خوار بچوں کو اسی کماد کے کھیت میں رکھ دیں۔ یہ ایک مشکل ترین مرحلہ تھا۔ کون ماں یہ کام کر سکتی ہے۔ مگر قافلے میں شامل لوگوں کے اسرار پر ماؤں نے یہ ناقابلِ یقین کام بھی کر ڈالا۔ ماؤں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے اس طرح کوئی بچوں کو اٹھا کر زندہ بچا لے وگرنہ سب مارے جائیں گے۔

۱۰ کے قریب بچے اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر مائیں قافلے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ ان ماؤں میں میری ماں جی (راجن بی بی) اور میری پھوپھی (فاطمہ) بھی تھیں۔ دونوں کے ۷ اور ۸ دن کے بچے خدا بخش (میرا بھائی) اور عمر خیام (میرا پھوپھی زاد بھائی) اللہ کے حوالے تھے اور کماد کے کھیت کے ایک کونے میں ننگے جسم ایک پھٹے ہوئے کپڑے کے ٹکڑے کے نیچے اپنی موت کے منتظر تھے۔ قافلہ روانہ ہوا دوسری عورتیں ان ماؤں کے منہ میں درختوں کے پتے ڈال کر ان کے رونے کو روک رہی تھیں۔

میری ماں جی اور میری پھوپھی فاطمہ ایک دوسرے کے بازو تھامے قدموں کو گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہی تھیں۔ ۵ میل کے سفر کے بعد ماں جی اور میری پھوپھی بیہوش ہو کر گر پڑیں۔ کھیت کا کائی سے ڈھپا پانی منہ میں ڈال کے قافلے والوں نے دونوں کو ہوش دلوائی اور تیز چلنے کا اسرار کیا اب ماں جی کے قدم نہیں اٹھ رہے تھے۔ پھوپھی اسے کھینچ کر چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچانک ماں جی نے میری پھوپھی کا ہاتھ جھٹکا اور واپسی کی طرف دوڑ پڑی۔ قافلہ آگے چلتا گیا، پھوپھی اور ماں جی آپس

میں بچھڑ گئے۔ پھوپھی نے صدیق (میرے بڑے بھائی) اور صدیقہ کو اسی جگہ ایک درخت کے سائے کے نیچے بٹھا دیا اور کہا کہ آپ کی بے بے ادھر ہی آئے گی۔ یہ دونوں بچے کافی دیر اپنی بے بے (میری ماں جی) کا انتظار کرتے رہے۔ اللہ نے مدد کی کسی اور قافلے کے ساتھ آرمی کی حفاظت میں پاکستان پہنچ گئے۔

ماں جی دوڑتی ہانپتی دونوں بچوں (خدا بخش اور عمر خیام) کے پاس پہنچی تو دیکھا کہ دونوں کا چہرہ پانی سے تر ہے۔ (ایک دن پہلے جو بارش ہوئی تھی وہ ان معصوم بچوں کے لیے رحمت بن گئی) بارش کا پانی قطرہ قطرہ ان کے چہرے پر ٹپکتا رہا اور ان معصوموں کی سانسیں چلتی رہیں۔ ماں جی نے دونوں بچوں کو دودھ پلایا اور اور دونوں کو اٹھا کر منزل کی طرف روانہ ہو گئیں۔

مسلمانوں کا ایک لٹا ہوا قافلہ نظر آیا ماں جی بچوں کو لے کر اس کے ساتھ مل گئی۔ ماں جی راستے میں بے ہوش ہو گئیں قافلے والے انہیں اسی طرح بے ہوش کو چھوڑ کے چلے گئے۔ ایک چرواہے نے بکری کا دودھ منہ میں ڈالا۔ جب ہوش آیا تو چرواہے نے اور دودھ دیا اور ماں جی نے بچوں کو بھی بکری کا دودھ پلایا۔ چرواہے نے ماں جی کو بتایا کہ دو میل کے فاصلے پر انگریز آرمی کا کیمپ ہے وہ مہاجرین کو پاکستان پہنچاتے ہیں۔

یہ قصور کے قریب کا ہی کوئی علاقہ تھا۔ ماں جی ۲۷ اگست کو پاکستان پہنچ گئیں اور لاہور کچھ عرصہ مہاجر کیمپ میں رہیں۔ ان کا ملاپ فروری ۱۹۴۸ء میں والد صاحب سے ہوا اور عمر خیام بھی ۹ ماہ بعد اپنی ماں (میری پھوپھی) سے فیصل آباد میں کسی کی مدد سے مل گیا۔ اس قافلے میں شامل باقی رشتۂ دار ہجرت کر کے پاکستان کے مختلف علاقوں میں آئے اور بعد میں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

❁❁❁

LIFE
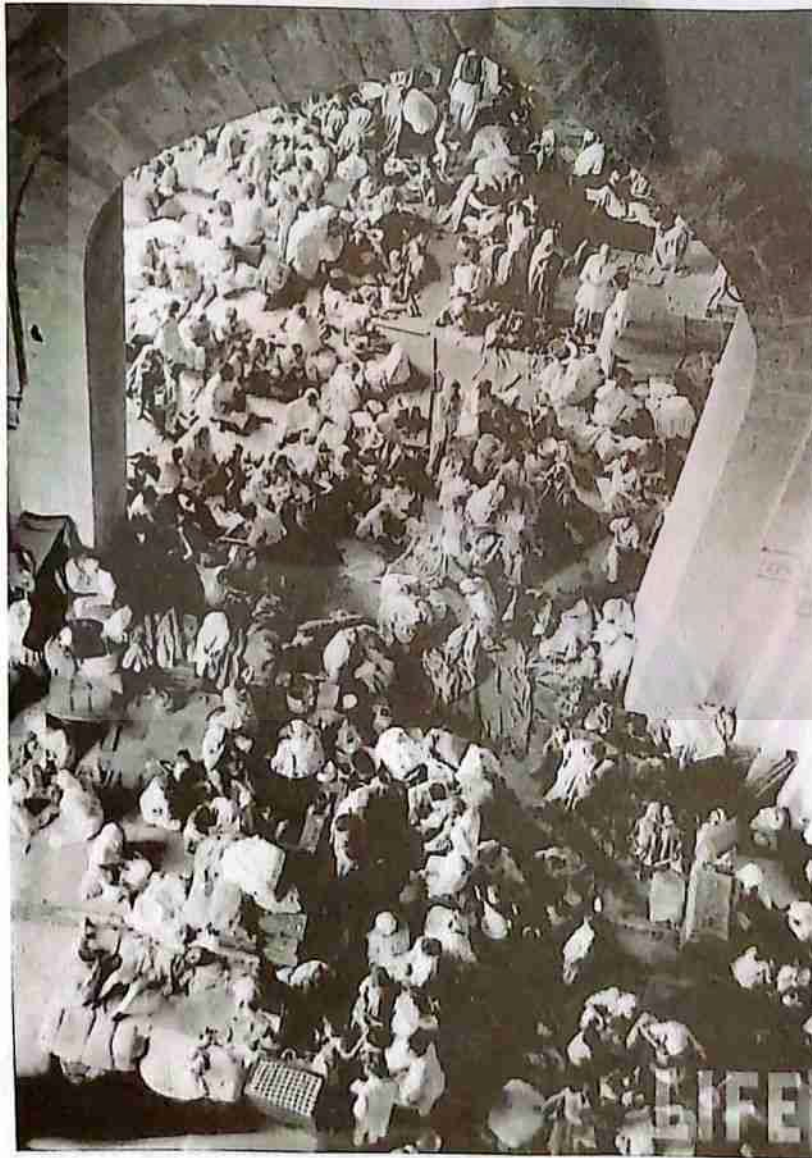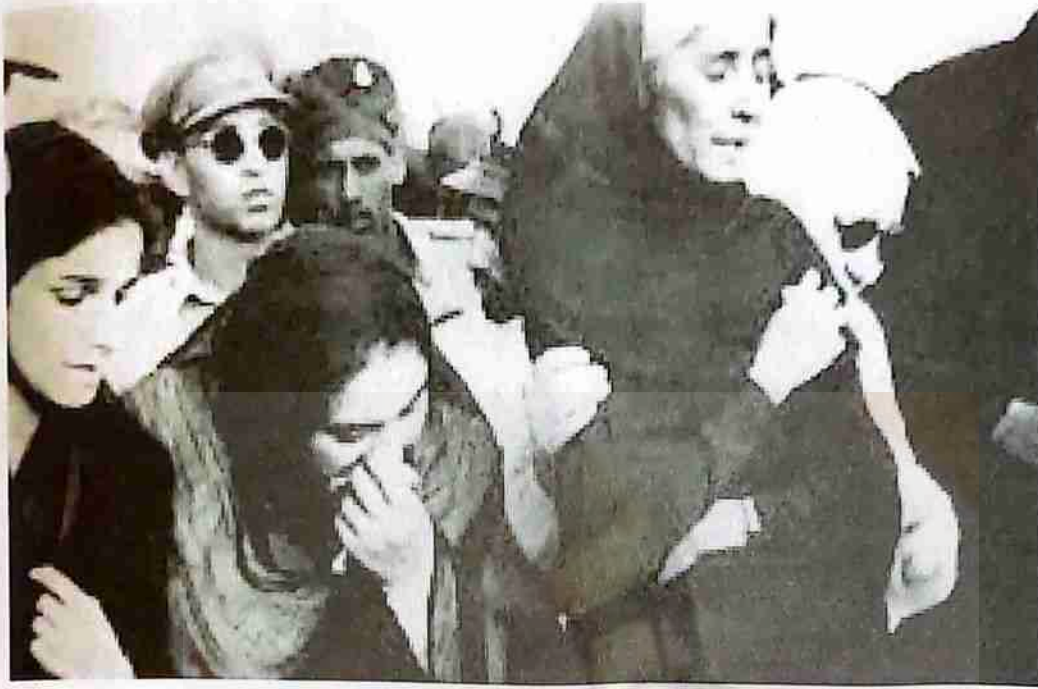
آٹھواں باب

چوہدری عطا محمد کی اپنے بیٹوں کے لیے وصیت اور خاندان کے آخری قافلے کی روانی

دادا جان (چوہدری عطا محمد) کی نرینہ اولاد یعنی چار بیٹے چوہدری جمال الدین (میرے ابا جی، جو اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے)، چوہدری کرم دین (میرے بڑے چچا)، چوہدری نظام الدین (میرے چچا) اور چوہدری امام الدین (میرے سب سے چھوٹے چچا) تھے۔ چوہدری عطا محمد نے ان چاروں بیٹوں کو بہت پیار کیا اور روانہ کرتے ہوئے ایک وصیت کی۔

میرے بہادر شیر جوانوں میں آپ کو اللہ کے حوالے کرتا ہوں، میں اگر پاکستان نہ بھی پہنچ سکوں تو میری روح آپ کے ساتھ سفر کرتی اس مقدس زمین کو بوسہ ضرور دے گی۔ قیامت کے دن میرا نام اس فہرست میں شامل ہوگا جن لوگوں کی سفارش کرتے ہوئے میرے پیارے آقا حضرت محمدؐ خوش ہو کر کہیں گے، کہ عطا محمد کا خون حصول پاکستان کی جدوجہد میں کام آیا۔ میرے جگر کے ٹکڑو پاکستان ہی ہماری پہچان ہوگی۔ بیجا پور ہماری جنم بھومی ضرور ہے اس کی یاد بھی بہت آئے گی مگر ہماری آنے والی نسلوں کی شناخت اور مان صرف اور صرف پاکستان ہوگا۔ مجھے محمد علی جناح کی باتوں کی پوری طرح سمجھ تو نہیں آتی مگر اس کے دل میں موجود پاکستان سے محبت میں محسوس کرتا ہوں، میرے دل میں بھی پاکستان کی بہت محبت ہے اور آپ سب نے بھی اس محبت پر فخر کرنا ہے۔ راستے میں جو بھی مشکل آئے پاکستان کی محبت کی خاطر برداشت کرنا۔ میرے بچو کبھی کسی کا حق نہ مارنا اور رزق حلال کما کر اپنی اولادوں کی

پرورش کرنا۔ غریبوں کا ہمیشہ خیال کرنا، اپنے حلال رزق میں سے غریبوں کو کھانا کھلایا کرنا ان کی دعائیں آخرت میں ضرور کام آئیں گی۔ اپنے اندر ایمان کی طاقت سے عشقِ رسولؐ اور حُبِّ اہلِ بیت کو ہمیشہ قائم رکھنا۔ اپنی بہنوں کا بہت خیال رکھنا ان کو ان کے حق سے ہمیشہ زیادہ ہی دینا۔ غربت بھی آئے گی مگر اپنا دل ہمیشہ سخی رکھنا اور آپ کے ہاتھ دینے والے ہونے چاہیے، کبھی کسی سے بھیک نہ مانگنا۔ اللہ کی ذات سے سب کچھ مانگنا وہ سب ضرورتیں پوری کرنے والا ہے۔ جمال آپ ''میرے بڑے بیٹے ہونے کے ناطے سب بہن بھائیوں کا خیال رکھنے کی آپ کی زیادہ ذمہ داری ہے۔ میں آپ سب کو اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔'' سب کو گلے لگا کر چوہدری عطا محمد نے اپنے جگر گوشوں کو اپنے عشق اور اپنی منزل کی طرف روانہ کیا۔

چوہدری عطا محمد نے انتہائی اعلیٰ حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے بیٹوں کو روانہ کیا۔ علم دین (علما لوہار) اس قافلے کو ایک محفوظ راستے پر ڈال کے واپس بیجا پہنچ گیا۔ اس نے واپس پہنچتے ہی چوہدری عطا محمد کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگا لیا اور چوہدری عطا محمد کو غور سے دیکھنے لگا۔ علم دین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ دکھ اور تھکاوٹ سے بھری آواز میں دادا نے علم دین سے پوچھا کہ ''کیا میرے بیٹے شہید ہو گئے؟'' علم دین نے کہا کہ چوہدری تیرے بیٹے جمال اور باقی سب کو ایک محفوظ راستے پر خیر و عافیت سے میں خود چھوڑ کے آیا ہوں، انشاء اللہ وہ اپنی منزلِ مقصود تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ علم دین نے چوہدری عطا محمد کو گلے لگایا اور کہا کہ ''مجھے تم کو دیکھ کے رونا آیا ہے، چوہدری تم تو شیر کی طرح بہادر ہو، دل کیوں ہار گئے ہو۔'' چوہدری عطا محمد بولے، ''علمیا میں واقعی تھک گیا ہاں'' دادا کی ساری دنیا ختم ہو گئی تھی، اب کڑی آزمائش کا وقت تھا۔ ایک بہت بڑے خاندان اور جائیدادوں کا مالک مضبوط انسان اب بالکل اکیلا رہ گیا۔ علما لوہار واحد سہارا اور امید کا ذریعہ تھا جو اَب بھی دادا کے پاس

تھا۔ پیر صاحب بھی جا چکے تھے اب کے عطا محمد اور چند ماہ پہلے کے عطا محمد میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

جمال الدین اپنے چھوٹے بھائیوں کرم دین، نظام الدین اور امام الدین اور دس اور عزیز و اقارب سمیت پاکستان کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے، ابھی بارڈر سے سات میل دور تھے، دن کی روشنی شروع ہوئی تھی اور چوہدری جمال الدین (میرے ابا جی)، اس کے بھائی اور دیگر ساتھی سکھوں کے حملے سے بچنے کے لیے ایک ویران کھنڈر نما گھر میں چھپ گئے تھے۔ سکھوں کا ایک بہت بڑا لشکر وہاں سے گزر رہا تھا لشکریوں نے پاؤں کے نشان دیکھ کر چوہدری جمال الدین اور ساتھیوں کا سراغ لگا لیا۔ چوہدری جمال الدین اپنے والد کی طرح ایک بہادر اور جوشیلہ نوجوان تھا اس نے اپنی دھوتی میں چھپایا ہوا خنجر نکالا اور ایک سکھ کو مار ڈالا۔ سکھوں نے جمال الدین کے تین ساتھیوں کو شہید کر دیا۔ اور باقی سب کو رسیوں میں باندھ کر قیدی بنالیا اور گھوڑوں پر سوار کر کے ایک طرف روانہ ہو گئے۔ چوہدری جمال الدین نے ان سے یہ سن لیا کہ وہ جمال الدین اور ساتھیوں کو کسی جگہ لے جا کے قتل کر دیں گے۔ ابا جی نے یہ بات اپنے بھائیوں اور ساتھیوں کو بھی بتا دی۔ چوہدری جمال اور ساتھی اللہ ھو کا ذکر کرنے لگے اور بار بار اللہ سے دعا کرتے ہوئے اپنی تقدیر کا انتظار کر رہے تھے۔

اچانک ایک اور سکھ حملہ آوروں کا قافلہ قریب سے گزرا۔ اس قافلہ میں موجود ایک سکھ نے جمال الدین کو پہچان لیا۔ وہ اجیت سنگھ (جیتا) بیجا کے ساتھ والے گاؤں کا تھا۔ اجیت سنگھ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے جمال الدین، اس کے تین بھائیوں اور باقی دس ساتھیوں کو بھی آزاد کروالیا۔ قریبی گاؤں میں لے جا کر جمال الدین اور ساتھیوں کو کھانا کھلایا۔ اجیت سنگھ کے گھر والوں پر چوہدری عطا محمد کے بے شمار احسانات تھے اور اجیت سنگھ چوہدری جمال اور باقی ساتھیوں کی دل سے مدد کرنا چاہتا

تھا۔اجیت سنگھ نے جمال الدین سے کہا کہ وہ سب کو بیجا چھوڑ آتے ہیں۔ میرے ابا جی رو پڑے اور کہنے لگے، ''اجیت بھائی بیجا میں میرے ابا جی (چوہدری عطا محمد) اکیلے ہیں ان کی مدد کرنا اور یہ ہم پر احسان ہوگا اگر آپ ہمیں بارڈر پار کروا کے پاکستان کی مقدس زمین پہنچا دو تو آپ کا یہ احسان میں اور میرے ابا جی (چوہدری عطا محمد) کبھی نہیں بھولیں گے۔''

اجیت سنگھ اپنے قریبی ساتھیوں کے ہمراہ جمال الدین کے مختصر قافلے کو بارڈر تک پہنچانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ابھی بارڈر سے دو میل دور تھے کہ وہاں سکھوں کے ایک اور مسلح گروہ نے گھیر لیا۔ وہ سب مسلمانوں کو قتل کرنا چاہتے تھے۔اجیت سنگھ نے اس گروہ کے سردار کو بتایا کہ یہ سب سکھ ہیں اور اپنے مویشی لینے جا رہے ہیں۔ اس پر اس سکھ سردار نے کہا کہ اگر یہ مسلے (مسلمان) نہیں ہیں تو ہمارا پکایا ہوا سور کا گوشت کھائیں تا کہ ہم کو یقین آئے کہ تم (اجیت سنگھ) سچ کہ رہے ہو۔اس گروہ میں کچھ سکھ اجیت کے رشتہ دار بھی تھے اجیت سنگھ نے ان کو مدد کے لیے تیار کیا۔ وہ جب پلیٹ میں خنزیر کا گوشت لائے تو جمال الدین اور ساتھیوں نے پلیٹ کو صرف ہاتھ لگا کر خالی منہ ہلایا اور گزر گئے۔ سکھوں نے جانے کی اجازت دے دی۔ کچھ دور گئے تو اسی لشکر کے کچھ جوانوں نے جمال الدین کے قافلے پر حملہ کر دیا۔ اجیت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے ڈٹ کر ان سے مقابلہ کیا اور جمال اور ساتھیوں کو کچھ نا ہونے دیا۔ ان ظالم حملہ آوروں سے بہادری سے مقابلے کرتے ہوئے اجیت سنگھ مارا گیا۔ وفادار اور بہادر اجیت سنگھ کی وجہ سے جمال الدین، اس کے بھائی اور باقی ساتھی الگ الگ پاکستان داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔اجیت سنگھ کی وفاداری کی مثالیں میرے ابا جی اکثر دیا کرتے تھے۔ اجیت سنگھ جیسے اور بھی بہت سے سکھ لوگ تھے جنہوں نے میرے ابا جی اور دادا جان کی بہت مدد کی۔ ابا جی دس

پندرہ سکھ کرداروں کا جب ذکر کرتے تھے تو اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ کتنے وفادار اور اچھے انسان تھے، مگر بدقسمتی سے بہت سے سکھ ہندوؤں کے بہکاوے اور دنیاوی لالچ میں آ گئے تھے اور انہوں نے مسلمان مہاجرین پر بہت ظلم کیے۔ آخرکار جمال الدین پاکستان پہنچ گیا۔ اس کے بعد جمال الدین اور اس کے خاندان نے ایک انتہائی کٹھن زندگی کا آغاز کیا۔ جس کا کچھ ذکر آگے بیان کیا گیا ہے۔

❁❁❁
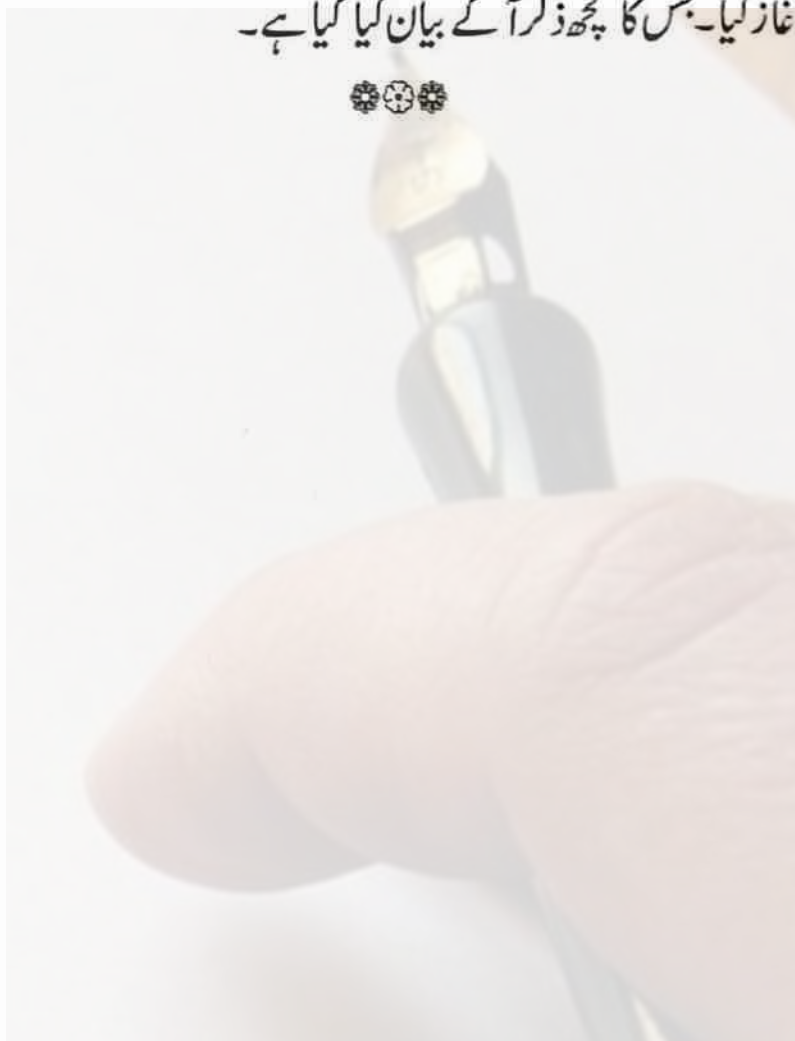
نواں باب

چوہدری عطا محمد کے کچھ یادگار احوال

چوہدری عطا محمد کی قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات

اور پاکستان سے محبت
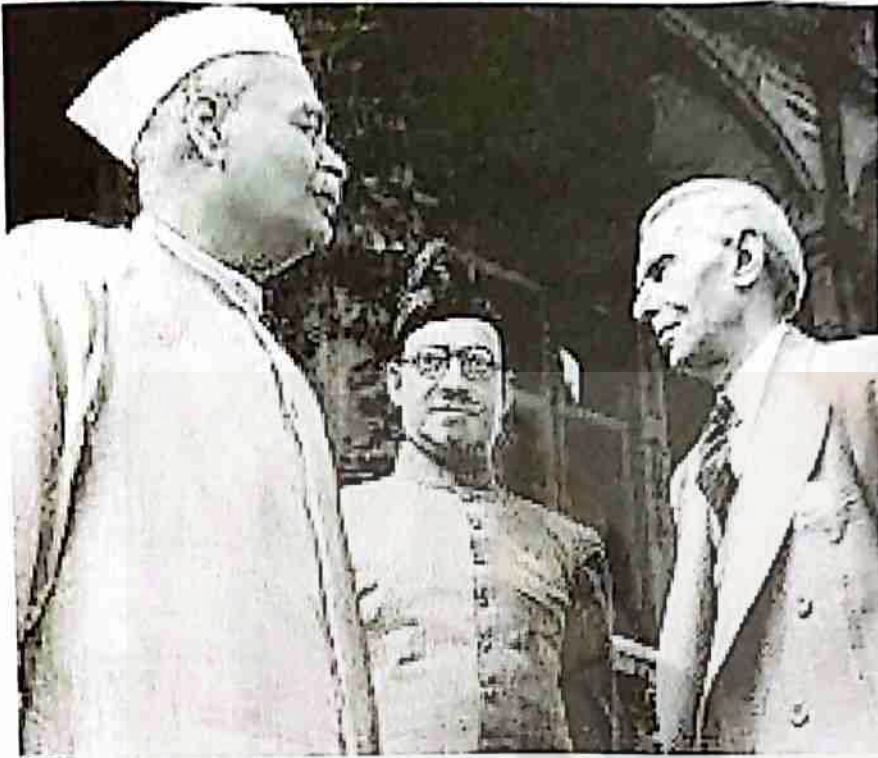
Pandit Govind Ballabh with Quaid-e-Azam Mohammed Ali Jinnah (right)

چوہدری عطا محمد کے گھر کے آگے ایک بیٹھک تھڑا تھا (تھڑا ایک بیٹھنے کے لیے بنائی گئی تھوڑی اُونچی سی جگہ جہاں لوگ بیٹھ کر گپ شپ لگاتے اور اگر کوئی مسئلہ ہوتا تو گاؤں کی پنچائیت دادا کی سربراہی میں اکٹھی ہوتی اور دادا کے فیصلوں کو بیجا پور کے لوگ ہمیشہ بخوشی قبول کرتے)۔ بیٹھک کے دوران گاؤں کے لوگ پاکستان بننے اور پنجاب کی تقسیم کی باتیں کرتے۔ دادا اکثر خاموش رہتے۔ جب لوگ چوہدری عطا محمد سے ان کی رائے پوچھتے تو وہ ایک گہری سانس لیتے اور کہتے کہ "اپنا دیس چھڈ نا اوکھا اے پر محمد علی جناح دی گلاں سچیاں تے کھریاں نے" ریڈیو پر جب قائداعظم کی تقریر نشر ہوتی تو دادا کسی پڑھے لکھے نوجوان کو بلایا کرتے جو جناح کی تقریر کا مطلب ان کو آسان لفظوں میں سمجھاتے۔ دادا کئی دفعہ بے ساختہ اونچی آواز میں نعرہ لگاتے، "پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" دادا کو ایک دفعہ قائداعظم محمد علی جناح سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ جب قائداعظم شملہ آئے تو چوہدری عطا محمد رحیم اللہ شاہ صاحب اور دو اور قریبی دوستوں کے ہمراہ قائداعظم کے پہنچنے سے پہلے ہی شملہ پہنچ گئے۔

شملہ میں جس شخص نے قائداعظم کی مہمان نوازی کا اہتمام کیا ہوا تھا ان کا ایک بھائی پیر رحیم اللہ شاہ صاحب کا مرید تھا۔ اس وجہ سے اس خاندان کے سب لوگوں نے پیر صاحب اور چوہدری عطا محمد کی بہت عزت افزائی کی۔ جب قائداعظم

محمد علی جناح تشریف لائے تو پیر صاحب اور دادا بھی استقبال کرنے والوں میں سب سے آگے تھے۔ میزبان فیملی کے سربراہ نے چوہدری عطا محمد اور پیر صاحب کا تعارف قائداعظم سے کروایا۔ چوہدری عطا محمد نے قائد اعظم سے بغلگیر ہوتے ہوئے قائداعظم کو بوسہ دیا ان کے ہاتھ چومے۔ اور مسلم لیگ کے چند لوگ جو قائداعظم کے ساتھ آئے تھے، چوہدری عطا محمد نے ان کو گزارش کی کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح سے چند منٹ کی ایک اور ملاقات کروا دیں۔ اس وقت قائداعظم جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہونے والے تھے، چند منتظمین نے عطا محمد کی ملاقات قائداعظم سے کروائی۔ دادا نے قائداعظم کی موجودگی میں مختصر سی بات کی۔

''جناح صاحب! اللہ کرے جو آپ مسلمانوں کے لیے کرنا چاہتے ہیں اس میں کامیاب ہوں۔ کیا پتہ کہ اس پاک دھرتی تک میں پہنچوں یا نا پہنچوں لیکن آج سے میرے خون کا ایک ایک قطرہ پاکستان کے لیے حاضر ہے۔''

دادا نے مسلم لیگ کے لیے پچاس تولے سونا (گولڈ) عطیہ دینے کا اعلان کیا۔ قائداعظم نے چوہدری عطا محمد کی اس مختصر مگر پرخلوص تقریر پر کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں اور چوہدری عطا محمد کو گلے لگا کر کہا ''تھینک یو چوہدری صاحب''۔ چوہدری عطا محمد باقی زندگی میں فخر سے قائداعظم محمد علی جناح کے الفاظ قائداعظم ہی کی طرح بول کر سناتے (تھینک یو چوہدری صاحب)۔ دس دن بعد سونا لے کر چوہدری عطا محمد اور پیر صاحب دہلی گئے اور یہ عطیہ میرے دادا جان چوہدری عطا محمد نے دہلی میں قائداعظم کو اپنے ہاتھ سے دیا۔ قائداعظم محمد علی جناح کی اس ملاقات نے چوہدری عطا محمد کی سوچ کو مزید پاکیزہ بنا دیا اور پاکستان کے لیے ان کے دل میں محبت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

جب بھی پاکستان کا کوئی نام لیتا تو چوہدری عطا محمد کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ ان کو اپنے گاؤں بیجا پور سے بھی بے پناہ محبت تھی مگر دل میں پاکستان سے

روحانی عشق تھا جو قائد اعظم سے ملاقات کے بعد اور مضبوط ہوگیا۔اب پاکستان چوہدری عطا محمد کا عشق تھا اور یہی ان کی منزل تھی۔ ''منزلِ عشق پاکستان''

چوہدری عطا محمد کی آخری بیساکھی اور بیجا پور کے لوگوں سے محبت

چوہدری عطا محمد کی زمینوں پر ہر سال بیساکھی (گندم کی کٹائی کا موسم) شروع ہوتے ہی ایک میلے کا سماں ہوتا تھا، ایک بہت بڑے کڑاہ (لوہے کا ایک بڑا برتن جس میں گنے کا رس اُبال کر گڑ بنایا جاتا ہے، پانچ سو لیٹر تک گنے کا رس اس میں ڈل سکتا تھا) میں دیسی گھی اور گڑ کا حلوہ تیار کیا جاتا تھا۔ تین چار بڑے زمیندار مل کے گھی اور گڑ اکٹھا کر کے حلوے کی تیاری کے لیے دیا کرتے تھے۔ اکثر چوہدری عطا محمد خود ہی سب انتظام کر لیا کرتا تھا۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے سب اکٹھے ہوتے۔ کبڈی، کشتی اور دوڑ کے مقابلے بھی ہوتے اور بیلوں کی دوڑ کا مقابلہ بھی خوب مزے کا ہوتا۔ دادا کو وینی (پنجاب کا مشہور کھیل جس میں دو جوان آپس میں مقابلہ کرتے ہیں پہلے ایک دوسرے کے بازو کو جکڑتا ہے اور دوسرا چھڑاتا ہے اس طرح باری باری تین یا پانچ بار مقابلہ ہوتا ہے) کا بہت شوق تھا اور وہ اس کے ماہر بھی بہت تھے۔ وینی پکڑنے کا خصوصی مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ دادا کی زندگی کا اس سال (اپریل ۱۹۴۷ء کو) یہ آخری بیساکھی کا تہوار تھا۔ چوہدری عطا محمد نے مارچ کے وسط ہی میں اعلان کروا دیا کہ اس سال بڑا تہوار (وڈی ویساکھی) ہوگا اور سب خرچہ چوہدری عطا محمد خود کریں گے۔ بیجا کے علاوہ بھی پورے پنجاب سے لوگوں کو دعوت دی گئی۔

دادا نے اپنے ساتھیوں کو اس بڑے تہوار کی تیاری پر لگا دیا۔ دادا نے اپنی فصلیں اور گھر میں پڑی اجناس وغیرہ فروخت کر کے تہوار کو یادگار بنا ڈالا۔ اس تہوار کے آخری دن لدھیانہ کے انگریز ڈپٹی کمشنر مہمان خصوصی کے طور پر آئے اور انہوں

نے بیجا کے نہری پانی کا پرانا مسئلہ کے حل کرنے کا اعلان کیا، جس سے گاؤں کے لوگ خوشی سے جھوم اٹھے۔

تہوار کے اختتام پر دادا نے ایک یادگار تقریر (پنجابی میں) کی:

''بیجا کے باسیو! اگلے سال پتا نہیں کہ میں ہوتا ہوں یا نہیں۔ مگر میں آج بیجا کا اتحاد دیکھ کر بہت خوش ہوں، دعا کرتا ہوں کہ ہمیشہ یہ اتفاق برقرار رہے۔ گاؤں کے کافی لوگوں سے میں نے ادھار لینا ہے اس بارے میں اعلان کرتا ہوں کہ جو آسانی سے جتنا ادا کرسکتا ہے وہ اتنا کردے جو ادا نہیں کرسکتا یا نہیں کرنا چاہتا تو اس کو میں سارا قرض اللہ کی خاطر معاف کرتا ہوں اس کے بدلے میں میرے اور میرے بچوں کے لیے دعا کر دینا۔ وہ لوگ جن کے پاس کھانے کے لیے گندم نہیں ہوگی، اس سال ان کو گندم ان کی ضرورت کے مطابق چوہدری عطا محمد مفت دے گا، اور میں (چوہدری عطا محمد) یہ بھی اعلان کرتا ہوں کہ موگے والے (موگا وہ جگہ جہاں سے زمیندار کی زمینوں کو پانی آنا شروع ہوتا ہے) دس کلے (ایکڑ) کی گندم اپنے پنڈ (گاؤں) کی مسجد اور گردوارے کے لیے (آدھی مسجد کو اور آدھی گردوارے کو) دوں گا۔ چھپڑ کے ساتھ میرے دو کلے زمین پر گاؤں کے نوجوان کبڈی اور باقی کھیلوں کے لیے گراؤنڈ تیار کرلیں۔ اگر میں نے کبھی بھی کسی کا دل دکھایا ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ اللہ سب کو خیر خیریت سے رکھے آمین۔''

بیجا پور اور گردونواح کے لوگ دادا کی باتیں سن کر رو پڑے اور سب نے دادا کو جپھی ڈالی اور پیار سے دادا کے ہاتھ چومے۔ سب لوگوں نے چوہدری عطا محمد کو بہت دعائیں دیں اور سب بہت خوش تھے۔

جن لوگوں نے دادا کا ادھار دینا تھا وہ سب باری باری اپنی پوری فیملی کے ساتھ دادا کا شکریہ ادا کرنے آئے کہ ان کا ادھار معاف کر کے چوہدری عطا محمد نے بہت بڑا احسان کیا۔ گاؤں والوں کا دیرینہ مسئلہ تھا کہ بیجا کا نہری پانی باقی دیہاتوں سے کم تھا اور زمینیں سیراب کرنے کے لیے گاؤں کے زمیندار کنوئیں سے ہی اپنی زمینیں سیراب کرتے تھے۔ دادا کی کوششوں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا، اس پر سب لوگ بہت خوش تھے۔ گاؤں کے نوجوان کبڈی اور باقی کھیل کھیلنے گاؤں سے دور کھنہ یا کسی اور قصبے کو جاتے تھے، دادا نے اپنی سب سے قیمتی زمین گاؤں کے نوجوان لوگوں کے کھیلنے کے میدان کے لیے دے دی، ان کا یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ گاؤں کی مسجد بہت چھوٹی تھی اسے کھلی اور نئی کر کے بہت خوبصورت بنا دیا گیا، سکھوں کا بھی خیال رکھا اور ان کے گردوارے کو بھی بہت اچھا کر دیا۔ دادا کے گھر میں گاؤں کی عورتیں روئی کاتنے کے لیے آ جاتی تھیں اور ایک کمرہ ان کے لیے چھوٹا تھا، دادا نے ایک بڑا ہال نما کمرہ گاؤں کی عورتوں کے لیے تیار کروا دیا۔ دادا بیجا پور نہ رہے مگر ان کا احسان بیجا پور والے قیامت تک یاد رکھیں گے۔

یہ چوہدری عطا محمد کا آخری بیساکھی کا تہوار تھا، انہوں نے اسے ایسا یادگار بنا ڈالا کہ بیجا کے لوگ زندگی بھر نہ بھلا سکیں۔ اس طرح کا فلاحِ انسانیت سے بھرپور اجتماع شاید قیامت تک دوبارہ بیجا کی سرزمین نہ دیکھ سکے۔ اس بیساکھی کے موقعہ پر دادا کے فراخدلانہ فیصلے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اور ان کے کیے ہوئے کام کئی نسلوں تک اللہ کی مخلوق کے لیے آسانیاں پیدا کرتے رہیں گے۔

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

❀❀❀
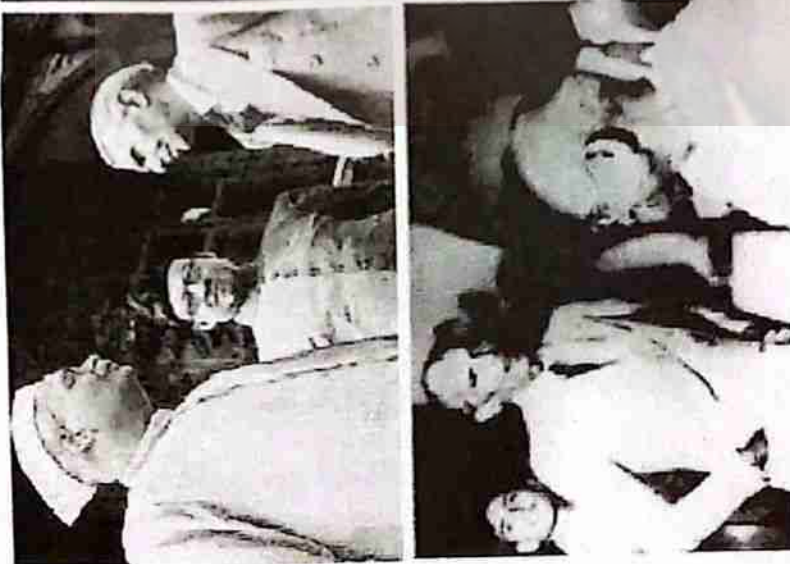
دسواں باب

راہِ حق کے ہیرو اور عظیم مجاہد چوہدری عطا محمد کے قافلے کی اعزازات کے ساتھ روانگی

منزلِ عشق کی راہ میں شہادت

LIFE
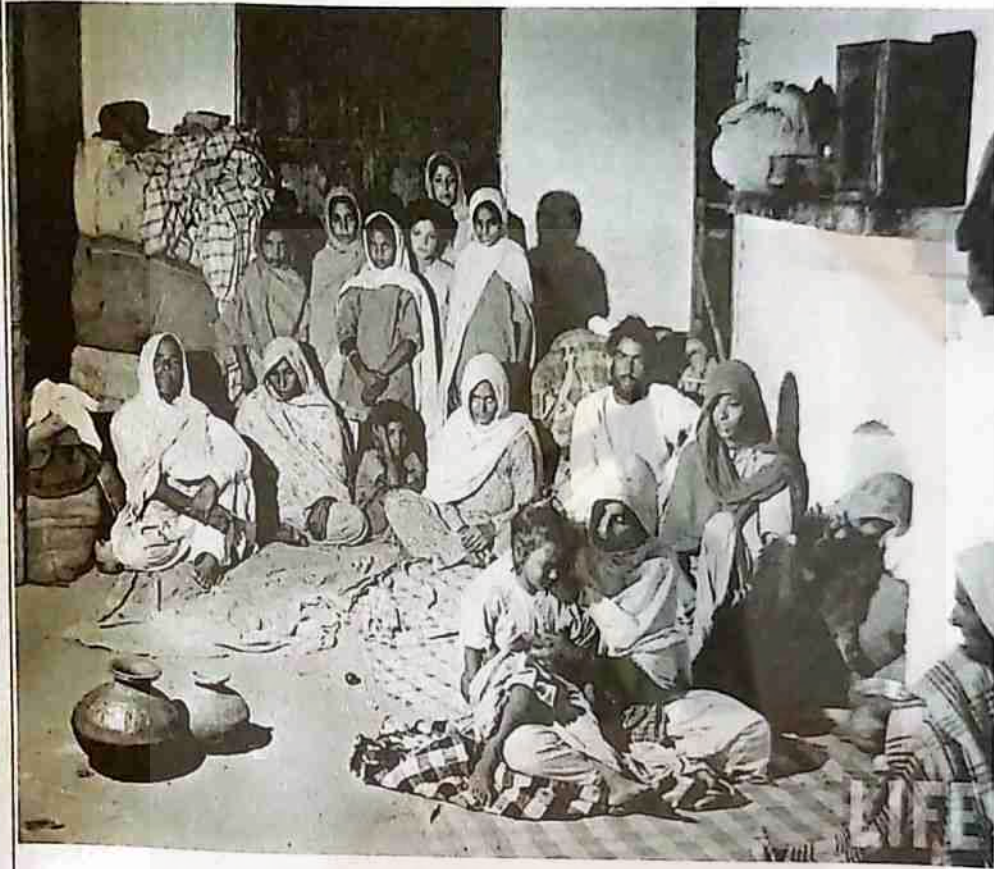
جب پاکستان بنا تو چوہدری عطا محمد کی عمر تقریباً ۶۰ سال تھی۔ وہ ایک انتہائی پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ اس کا قد ۶.۱ فٹ تھا، کشادہ سینہ اور سرخی مائل گندمی رنگت تھی اس کا خوبصورت چہرہ اور اس پر خوب سجتی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ چوہدری عطا محمد کی چمکدار آنکھیں اور بارعب چہرہ تھا۔ وہ بلاشبہ ایک لا جواب شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بارعب اور پروقار انسان تھے۔ اپنے پرائے سب چوہدری عطا محمد کی تعریف کرتے۔ میرے دادا (چوہدری عطا محمد) ایک بڑے زمیندار اور مشہور انسان تھے۔ ایک ایسے امتحان سے گزرے جس میں کامیابی کے لیے ان گنت قربانیوں کی ضرورت تھی اور چوہدری عطا محمد نے تمام قربانیاں دے کر اللہ تعالیٰ سے اپنی آیندہ نسلوں کو ایک لازوال دولت آزاد پاکستان جیسی نعمت دلوائی۔

۳۰ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح دادا نے اور علم دین نے فجر کی نماز کے بعد اپنی پسندیدہ بھوری بھینس کے دودھ، لسی، مکھن اور گڑ کے ساتھ اکٹھے ناشتہ کیا۔ سب جانوروں کو کھول کر فصلوں میں چھوڑا، گھر کا بچا کھچا سامان صحن میں چارپائیوں پر رکھ دیا۔ ایک قرآن پاک، السی کی کچھ پنیاں، دو سفید چادریں اور کچھ بچی ہوئی نقدی اپنے پاس رکھی اور ایک گٹھلی (جس میں خاندانی شجرہ، زمین کے کاغذات، کچھ کپڑے، کھانے پینے کا سامان اور چند برتن تھے) علم دین کے حوالے کی۔ اپنی ہی زمین پر بنائی گئی خاندان کے بزرگوں کی قبروں پر گئے اور فاتحہ پڑھی (میری دادی

زینب، نانا مہی خان، نانی مریم سمیت عطا محمد کے باقی آباؤ اجداد جن میں غندیلہ اور فطی وغیرہ کی قبریں شامل کر کے کل ۷۰ کے قریب قبریں تھیں)۔

سب مزارات کی زیارت اور فاتحہ کے بعد ایک سکھ دوست کو کہہ کر گندم اور باقی اجناس گاؤں کے غریبوں میں تقسیم کروائی۔ ۱۰ بجے کے قریب سارے گاؤں سے لوگ الوداعی ملاقات کے لیے کھڑے دادا کا انتظار کر رہے تھے۔

سب سے ملنے کے بعد دادا اور علم دین پہلے سے تیار قافلے کے پاس پہنچ گئے۔ ایک بہت بڑی بگھی جس پر ۳۶ گھوڑے جتے ہوئے تھے اور اس کے آگے اور پیچھے ۵۰ کے قریب دوسرے گھوڑ سوار قافلے کے ساتھ روانہ ہونے کے لیے تیار تھے۔ گاؤں کے رشتہ دار اور دوسرے سکھ بنائے گئے منصوبہ کے تحت دادا کو بگھی میں بٹھا کے پورے اعزازات کے ساتھ بارڈر تک لے جانے کے لیے تیار کھڑے دادا کا انتظار کر رہے تھے۔ دادا کے ساتھ بگھی میں صرف علم دین اور گاؤں کا سکھ نمبر دار جیون سنگھ بیٹھ گئے۔

چوہدری عطا محمد کا یہ لازوال قافلہ منزلِ عشق کی طرف روانہ ہوا۔ بیجا پور سے مغرب کی طرف جانے والی کچی سڑک کے دونوں طرف کافی لوگ دادا کو الوداع کہنے کے لیے کھڑے تھے۔ دادا نے سب کو بگھی پر کھڑے ہو کر ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہا۔

راستے میں بھی کئی لوگ دادا کو آخری بار دیکھنے کے لیے منتظر کھڑے تھے۔ بہت سے لوگوں نے دادا کو تحفے پیش کیے جس سے بگھی کی تمام خالی جگہ بھر گئی۔ دادا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں مگر اپنے وقار کو برقرار رکھتے ہوئے رونے پر قابو رکھا۔ راستے میں ایک بڑے سکھ خاندان نے کھانے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ دادا کا قافلہ وہاں رکا اور دادا اور علم دین نے ظہر اور عصر کی قصر نمازیں ادا کیں۔ کھانے کے بعد اس گاؤں کے سکھ سردار نے دادا کی دستار بندی کی اور تحفے دیئے۔ پورے راستے

میں کسی قسم کا کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا کیوں کہ سکھوں کا ایک مضبوط گروہ خود حفاظت کر رہا تھا۔ مغرب کے قریب دادا جان کا قافلہ ایک گاؤں فرید گوٹھ پہنچا۔ یہ گاؤں قصور شہر کے قریب گنڈا سنگھ بارڈر کے بالکل ساتھ انڈیا کی سائیڈ پر ہے۔ اس گاؤں میں اس وقت تک زیادہ مسلم آبادی تھی۔ دادا اور علم دین نے بارڈر پر بوسہ دیا اور بالکل بارڈر کی لائن کراس کر کے پاکستان کی مقدس دھرتی پر مغرب اور عشاء کی نماز ادا کی۔ دادا اور علم دین سب کا شکریہ ادا کر کے بارڈر پار کر کے آگے روانہ ہونے کے لیے بے تاب تھے۔ ان کو اپنی منزلِ عشق نظر آ رہی تھی۔ الوداع کرنے کے لیے آئے سکھوں نے دادا سے اللہ کا واسطہ دے کر ایک آخری خواہش کے طور پر گزارش کی کہ آج کی رات ہم سب کے ساتھ اکٹھے فرید گوٹھ میں گزاریں اور صبح سورج نکلتے ہی اپنی اپنی منزلوں کو سب لوگ چلے جائیں گے۔ دادا کا عشق اور منزل دادا کی نظروں کے سامنے تھی اور دادا ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر پاکستان کی مقدس دھرتی پر جانے کو بے قرار تھے مگر اپنے سکھ دوستوں کے اصرار پر رات ان کے ساتھ گزارنے کو تیار ہو گئے۔ فرید گوٹھ کے سکھوں اور مسلمانوں نے میزبانی بہت خوشی سے کی۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد صبح بچھڑ جانے کی اُداسی کو دُور کرتے ہوئے رات ۲ بجے تک جی بھر کے باتیں کیں۔ پھر سب نے کہا کہ چوہدری عطا محمد کو آرام کرنا چاہیے کیونکہ اس نے کل صبح سفر پر روانہ ہونا ہے۔ دادا جان تو تصور میں بھی اپنے عشق اور اپنی منزل سے باتیں کر رہے تھے۔ ’’گلاں مکیاں نہ ماہی نال میریاں تے رباتیری رات مک گئی۔‘‘

ان تمام سکھوں میں صرف ۴ لوگ بے ایمان تھے اور ان چار لوگوں کا ایک منافقانہ منصوبہ تھا جس کا علم ان چاروں کے سوا کسی اور کو نہ تھا۔ دادا اور علم دین کو تو اس سازش کا اندازہ اور اندیشہ بالکل نہیں تھا۔ یہ چاروں افراد دادا کے رشتہ دار ماھنی سنگھ، گبھرا سنگھ، راجندر سنگھ اور گلبیر سنگھ تھے۔ ان کا مقصد دادا سے بچا کی جائیداد کے کاغذ

حاصل کرنا اور دادا کو قتل کر کے ثبوت ختم کرنا تھا تا کہ وہ دادا کی بیجا پور میں موجود ساری جائیداد قابو کر سکیں۔ ۲ ستمبر ۱۹۴۷ء کی رات تقریباً صبح ۵ بجے ان چار میں سے دو نے علم دین کو جگایا اور کہا کہ آرام سے چوہدری عطا محمد کو جگاؤ ہم چائے بنا رہے ہیں اور آپ دونوں اتنی دیر میں فجر کی نماز پڑھ لیں۔

ان چاروں نے اس جگہ سے تین سو میٹر دور آگ جلائی اور چائے بنانے لگے۔ دادا اور علم دین نے اس جگہ کے پاس ہی نلکے سے وضو کیا۔ اور نماز کے لیے چادر بچھائی۔ علم دین نے اپنی گٹھڑی اسی جگہ رکھ دی جہاں وضو کیا تھا۔ جونہی دادا جان اور علم دین سجدے میں زمین پر پیشانی لگائے تسبیحات پڑھ رہے تھے ان چاروں بد بختوں اور بے ایمانوں نے تیز دھار گنڈاسوں سے حملہ کر کے چوہدری عطا محمد اور علم دین کو شہید کر دیا۔ شور کی آواز سن کر کچھ فاصلے پر موجود دادا کے وفادار سکھ جاگ گئے اور عطا محمد (میرے دادا) کو تلاش کرتے کرتے ان کی اور علم دین (دونوں شہیدوں) کی لاشوں پر پہنچ گئے۔ دادا کے تمام وفادار سکھوں کو بے حد رنج ہوا۔ جب یہ لوگ واپس بیجا پور گئے تو ان کی اور دادا کے قاتلوں کی خونی جنگ ہوئی۔ دونوں طرف سے ۲۷ لوگ مارے گئے۔ دادا کے وفادار سکھوں نے فرید کوٹھ کے مسلمانوں کی مدد سے دادا کو بالکل زیرو لائن بارڈر پر دفن کر دیا۔

؎ جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

دادا کو غسل دیئے بغیر جب نماز جنازہ پڑھانے لگے تو اچانک ایک بزرگ صوفی نور محمد وہاں آ گئے اور انہوں نے جنازہ پڑھانے کے بعد ایک سبز چادر دادا کی میت پر ڈالی اور کہا کہ یہ چادر وہ مدینہ شریف سے لائے تھے۔ یہ چادر پاکستان بننے کی خوشی میں مسجد نبوی کے ایک خادم (خاکروب) نے مجھے تحفے میں دی تھی۔

صوفی نور محمد امرتسر کے رہنے والے تھے۔ ان کا سارا خاندان ہجرت کے دوران شہید ہو گیا اور صوفی صاحب خود عمرہ کرنے حجاز مقدس گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر ان کو معلوم ہوا کہ اس کا سارا خاندان شہید ہو گیا۔ صوفی نور محمد ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آ کر آباد ہوئے۔ پاکستان بننے کے ۴ سال بعد پیر رحیم اللہ شاہ صاحب نے میرے والد کی ملاقات صوفی نور محمد سے کروائی۔ ان کی راہنمائی سے میرے والد صاحب اور چچاؤں نے انڈیا سے زمین کے ثبوت اور خاندانی شجرہ حاصل کیا جس کی وجہ سے (وراثتی کلیم پاس ہوا) ان کو چنیوٹ اور رحیم یار خان میں زرعی زمین ملی۔

❀❀❀

۱۔ چوہدری عطا محمد کلار کی جائے پیدائش اور آبائی گاؤں بیجا پور
۲۔ چوہدری عطا محمد کلار کی آخری قیام گاہ فرید گوٹھ
۳۔ چوہدری عطا محمد کلار شہید کی جنازے کی جگہ
۴۔ چوہدری عطا محمد کلار شہید کی تدفین (مزار) کی جگہ

گیارہواں باب

چوہدری عطا محمد شہید کے خاندان کے چند اہم کرداروں کا مختصر تذکرہ

زینب (میری دادی) چوہدری عطا محمد (میرے دادا) کی اہلیہ کا انتقال پاکستان بننے سے ۲ سال قبل ۱۹۴۵ء میں ۷۵ سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ زینب ایک سمجھدار باوقار اور اسلامی روایات اپنانے والی خاتون تھیں۔ زینب کی شخصیت ایسی تھی کہ ان سے ان کی بہو (راجن بی بی) سمیت تمام چھوٹی عمر کی عورتیں بہت ڈرتی تھیں۔ گاؤں کی عورتیں زینب کو اپنی راہبر اور بزرگ مانتی تھیں۔ زینب (دادا کے گھر) ایک تینجن (تینجن پنجابی میں عورتوں کے اکٹھے ایک جگہ بیٹھ کے روئی کاتنے کو کہتے تھے، جہاں عورتیں ایک اچھے ماحول میں روئی کاتنے کے ساتھ ساتھ خوب ہلہ گلہ اور گپ شپ لگاتی تھیں) کی سربراہ بھی تھی، تینجن میں زینب سب کو اجازت دیتی کہ جو مذاق یا ہلہ گلہ کرنا چاہے ہر عورت بلا جھجک کر سکتی تھی۔ زینب کی وفات نے دادا کو بہت رنج پہنچایا۔ دادا اکثر دادی کا ذکر کرتے کرتے رو پڑتے تھے۔ اللہ اس عظیم عورت (زینب میری دادی) کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

مہی خان (میرے نانا جان) عطا محمد کے سمدھی تھے۔ ان کا انتقال بھی پاکستان بننے سے ۳ سال پہلے ہو گیا تھا، انتقال کے وقت ان کی عمر ۴۷ سال تھی۔ وہ ایک نرم مزاج انتہائی ملنسار انسان تھے۔ عطا محمد کی بہت عزت کرتے تھے۔ چوہدری مہی خان پنجابی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ انہوں نے پاکستان اور قائداعظم کے لیے بھی شاعری کی۔

مریم بی بی (میری نانی) چوہدری مہی خان کی بیوی تھی وہ بھی انتہائی سمجھدار

اور سنجیدہ خاتون تھیں۔ ان کا انتقال بھی پاکستان بننے سے دو سال قبل ہو گیا تھا۔ مریم ایک سادہ اور نرم طبیعت کی عورت تھی۔ اس نے مہمی خان اور اپنے بچوں کی اچھی تربیت کی۔ ان کا بیٹا کرم بخش (میرا ماموں) کشتی کرتا تھا مریم اس کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھتی تھی۔

مہمی خان کی اولاد (میرے ماموں اور خالہ) مہمی خان کے بڑے بیٹے چوہدری کرم بخش (میرے ماموں) پاکستان بننے کے وقت ۳۸ سال کے تھے۔ ان کے دو بیٹے محمد رمضان ۱۱ سال اور رحم دین ۷ سال کے تھے۔ چوہدری کرم بخش انڈیا میں کشتی (ریسلنگ) کرتے تھے۔ وہ پورے انڈیا میں مشہور تھے۔ جب پاکستان بنا اور کرم بخش ہجرت کر کے پاکستان آ گئے تو ان کے پنجابی سکھ شاگردوں کو بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے بہت سے اعزازات جیت رکھے تھے۔ برطانوی حکومت نے ان کو کشتی میں اعلیٰ مہارت کی وجہ سے رستم ہند کا خطاب (ٹائٹل) عطا کیا تھا۔ ان کو حکومت کی طرف سے باقاعدہ وظیفہ ملتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد چوہدری کرم بخش چک ۹۳ ج۔ب (پکا انا ریلوے سٹیشن کے پاس) میں آباد ہوئے۔ ان کے سکھ شاگرد جب ننکانہ صاحب آتے تو کرم بخش کو ملنے ۹۳ چک آیا کرتے تھے، چوہدری کرم بخش کے سکھ شاگرد ہر سال ان کی دستار بندی کرتے تھے۔ وہ بہت مذاق اور شغل کرنے والے، یاروں کے یار، ہنسنے ہنسانے اور خوش رکھنے اور خوش رہنے والے زندہ دل انسان تھے۔ مجھے ان سے خاص لگاؤ تھا۔ ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو میں ان کے پاس بیٹھا تھا جب جنرل ضیاء الحق کا طیارہ کے حادثے میں انتقال ہوا تھا۔ کسی نے ماموں کرم بخش کو بتایا کہ ایک بہت بڑے انسان اور پاکستان کے صدر جنرل ضیاء کا جہاز میں انتقال ہو گیا ہے، ماموں نے اس پر بھی مذاق کرتے ہوئے کہا کہ، وڈا بندا سی تاں ای تے ایڈا اتے جا کے آسماناں تے مریا، کوئی ساڈے ورگا ہندا تے نِکے جئے ٹھڈے نال ای مر جاندا۔

ماموں کو جب میرے فوج میں آفیسر بننے کا پتہ چلا تو بہت خوش ہوئے تھے اور بڑے مان سے سب کو بتاتے تھے کہ میرا بھانجا فوجی افسر ہے۔ مجھے اپنے والدین کے علاوہ خاندان کی جن دو شخصیات نے سب سے زیادہ متاثر کیا ان میں ایک ماموں کرم بخش اور دوسری پھوپھی فاطمہ عرف رلی تھیں۔ ان دونوں میں منافقت بالکل نہیں تھی، صاف دل اور کھرے سچے انسان تھے۔ ان دونوں سے میرے ابا جی کو بھی خاص لگاؤ تھا۔ چوہدری کرم بخش کا انتقال ۱۹۹۵ء میں ہوا۔

پیر سید رحیم اللہ شاہ صاحب چوہدری عطا محمد اور ان کے بڑے بیٹے چوہدری جمال الدین (میرے ابا جی) کے مرشد تھے۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیسے پاکستان پہنچے وہ صرف اتنا بتاتے کہ اللہ نے کرم کیا اور وہ پاکستان آ گئے۔ پیر صاحب کا چوہدری عطا محمد کے کلار خاندان پر بڑا احسان ہے انہوں نے ہمیشہ حق اور سچ کا راستہ دکھایا۔

میرے دوسرے ماموں دھرم بخش عرف دھرما ایک انتہائی شریف انسان تھے۔ اپنے بڑے بھائی کرم بخش کا بیحد احترام کرتے تھے۔ ماموں دھرم بخش کی شادی میری پھوپھی مالن سے ہوئی تھی۔ دھرم بخش کا انتقال ۱۹۹۶ء میں ہوا۔

میری خالہ دھرم بی بی عرف دھرموں کا اور میری ماں جی کا آپس میں بہت پیار تھا۔ میرے خالو رحیم اللہ اور خالہ پاکستان آنے کے بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ شہر میں آباد ہوئے وہیں دونوں کا انتقال ہوا۔ ان کے تین بیٹے غلام محمد (مرحوم)، امانت علی (مرحوم)، اور رحمت عرف بگا اور دو بیٹیاں عمری (مرحومہ)، اور تاج بی بی عرف تاجاں (مرحومہ) تھیں۔

چوہدری عطا محمد کلار شہید کی اولاد میں ان کے بڑے بیٹے چوہدری جمال الدین کلار کا ذکر آگے بیان کیا گیا ہے۔ باقی بیٹوں میں کرم دین، نظام الدین اور امام الدین (میرے تینوں چچے) کو میرے ابا جی نے زمین کا کلیم پاس ہونے کے بعد ان زمینوں پر

غوث پور ضلع رحیم یار خان میں آباد کر دیا تھا۔ میرے چچا نظام الدین کی کوئی اولاد نہ تھی چچا نظام کا انتقال جولائی ۱۹۸۸ء میں ہو گیا۔ باقی دونوں چچوں کا انتقال بھی غوث پور میں ہی ہوا۔ ان دونوں کے اولاد ابھی بھی غوث پور میں ہی ہے۔ کرم دین کی اولاد میں سے یعقوب (مرحوم)، گلزار (مرحوم)، رمضان (مرحوم) اور سلطان اور ایک بیٹی (مرحومہ) تھی۔

چوہدری عطا محمد شہید کی بیٹیوں میں فاطمہ عرف رلی کا ذکر آگے بیان کیا گیا ہے۔ شریفن بی بی کی اولاد میں سے اسلم، اشرف اور صغراں ہیں۔ مالن (میری پھوپھی) کی شادی دھرم بخش (میرے ماموں) سے ہوئی دونوں چک ۹۳ پکا انا میں ہی آباد تھے اور وہیں دونوں کا انتقال ہوا۔ ان کی اولاد میں معراج دین، محمد اقبال، محمد انور (تین بیٹے)، نیا متے، بیبو، تاجاں، ثریا اور سلامتے (پانچ بیٹیاں) ہیں۔

مجیدن (میری چھوٹی پھوپھی) کی شادی چوہدری فتح محمد سے ہوئی اور یہ ننگل گاؤں (پینسرہ اور گوجرہ کے درمیان) میں آباد ہوئے وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی اولاد میں افضل (ایک بیٹا) بشیراں، نزیراں، شبیراں اور منیراں (چار بیٹیاں) ہیں۔

چوہدری عطا محمد کلار ایک بہت بڑا زمیندار تھا مگر اس کا خاندان جب ہجرت کر کے پاکستان آیا تو سب لوگ مفلسی اور بے چارگی کا شکار رہے۔ مگر سب نے اللہ کی مدد سے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا اور اپنی زندگی اللہ کے توکل پر گزاری۔ چوہدری عطا محمد کی ساری اولاد اس عظیم جدوجہد کا حصہ تھیں۔ جس کی قیادت چوہدری عطا محمد نے کی۔ جب انہوں نے اپنی اولاد کو پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا تو یہ فیصلہ ان کا اہم ترین فیصلہ تھا۔ اس فیصلے کے پیچھے چوہدری عطا محمد کی مجبوری نہیں بلکہ ایک عشق تھا جو اس کو اپنی منزل مقصود پاکستان سے تھا۔ اللہ تعالیٰ چوہدری عطا محمد اور اس کے خاندان کے تمام لوگوں کی قربانیوں کو قبول فرمائے۔ آمین۔

❀❀❀

بارھواں باب

پاکستان بن گیا مگر جدوجہد اب بھی جاری

چوہدری عطا محمد کی اولاد اور رشتہ داروں کے لیے

کٹھن آزمائش

چوہدری جمال الدین (میرے ابا جی) چوہدری عطا محمد شہید کے بڑے بیٹے، راجن بی بی (میری ماں جی) بڑی بہو اور فاطمہ عرف رلی (میری پھوپھی) ان کی بڑی بیٹی تھی۔ ان تینوں شخصیات نے چوہدری عطا محمد شہید اور ان کے تمام رشتہ داروں (جو انتہائی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے پاکستان کے مختلف علاقوں میں مہاجر بن کر آئے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے رحم و کرم کے سہارے کے سوا بے ساز و سامان اور بے یار و مددگار تھے) کو دوبارہ یکجا کر کے زندگی کا آغاز کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ چوہدری عطا محمد شہید کے باقی بیٹے اور بیٹیاں ان تینوں کی سر پرستی میں رہے اور اپنی اپنی زندگی اچھے انداز میں گزار کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان سب نے بھی انتہائی مشکل وقت دیکھا مگر چوہدری جمال الدین، راجن بی بی اور فاطمہ عرف رلی کے کردار نا قابل فراموش ہیں اس لیے ان کا تذکرہ مختصراً پیش خدمت کر رہا ہوں۔

فاطمہ عرف رلی (میری بڑی پھوپھی) انتہائی سمجھدار، باوقار اور ملنسار خاتون تھیں۔ ان کے شوہر (میرے پھوپھا) غلام محمد عرف گاماں برطانوی حکومت کے سرکاری ملازم تھے اور خاندان میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے شخص تھے۔ پاکستان بننے کے وقت فاطمہ عرف رلی ۳۶ سال اور غلام محمد عرف گاماں ۴۱ سال کے تھے۔ گاماں جٹ ڈھلوں خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ جب ہجرت کر کے پاکستان آئے تو ان کے چار بیٹے عبدالعزیز (۱۱ سال)، عمر دین (۱۰ سال)، محمد گلزار (۸ سال) اور عمر

خیام (چھ ماہ) کے تھے۔ ایک بیٹی رحموں انڈین پنجاب ہی میں رہ گئی تھی۔ ان میں سے عبدالعزیز، عمر دین اور رحموں کی وفات بھی ہو چکی ہے۔

اس خاندان (یعنی غلام محمد عرف گاماں ڈھلوں کی اولاد) میں چوہدری گلزار سب سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں، وہ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے، پنجاب گورنمنٹ کی ملازمت کی اور ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے۔ وہ اس وقت تقریباً ۸۳ برس کے ہیں میں نے ان سے بھی اپنے خاندان کے بارے میں کافی معلومات حاصل کیں۔

غلام محمد عرف گاماں ہجرت کے وقت اپنی ملازمت کی مصروفیات کی وجہ سے اپنے خاندان کی خاص مدد نہ کر سکے مگر پاکستان بننے کے بعد ملازمت ترک کر کے پاکستان آ گئے۔ اس کے بعد اس نے اپنے خاندان اور رشتہ داروں کی بہت مدد کی اور ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کا انتقال ۱۹۷۶ء میں ہوا۔

فاطمہ عرف رلی (میری پھوپھی) جو خود بھی کلار خاندان کی تھی اس نے ڈھلوں اور کلار خاندان کے لیے بہت کام کیا۔ ان کی وجہ سے دونوں خاندان آپس میں بہت قریبی اور اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ خصوصاً عبد العزیز اور محمد صدیق (میرے بڑے بھائی جو ۲۰۲۰ء میں انتقال فرما گئے) کی بہت پکی دوستی تھی۔ اسی طرح عمر دین، اس کی بیوی غفوراں بی بی اور ان کے باقی رشتہ داروں کے ساتھ جمال الدین اور راجن بی بی کے بہت ہی اچھے تعلقات تھے۔ غفوراں بی بی کچھ خاندانی مسائل کی وجہ سے ۴ سال تک راجن بی بی کے پاس رہیں۔ اسی لیے ان دونوں کا آپس میں بہت زیادہ پیار تھا۔ جمال الدین کلار اور غلام محمد عرف گاماں ڈھلوں دونوں (کلار اور ڈھلوں) رشتہ دار خاندانوں کے اتنے اچھے مراسم تھے کہ لوگ اس کی مثال دیا کرتے تھے۔ فاطمہ عرف رلی اور جمال الدین دونوں بہن بھائیوں کا پیار مثالی تھا۔ دونوں کبھی بھی ایک دوسرے کی بات نہیں ٹالتے تھے۔ فاطمہ

عرف رلی (میری پھوپھی) مجھ سے بیحد پیار کرتی تھیں۔ اور مجھے بھی وہ بہت اچھی لگتی تھیں ان کا انتقال ۱۹۹۵ء میں ہوا۔ غلام محمد عرف گاماں ڈھلوں کے انتقال کے بعد اس خاندان اور جمال الدین کلار کے خاندان کے تعلق پہلے کی طرح نہ رہے بلکہ آپس میں ملنا جلنا بھی ختم ہو گیا۔ اس سرد مہری کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی بس اپنے اپنے گھروں کو سنبھالنے میں لگے رہے۔ دونوں خاندانوں کی ماضی کی مثالی قربت کو جانتے ہوئے ۱۹۹۰ء سے لے کر ابھی تک میری یعنی ڈاکٹر محمد رفیق (مصنف) کی کوششیں جاری ہیں کہ دونوں خاندان آپس میں ملتے جلتے رہیں اور کافی حد تک ان کا ملنا جلنا بحال ہوا ہے۔ یہاں تک کہ میں نے ہمیشہ گاماں ڈھلوں کے خاندان (خصوصاً غلام محمد عرف گاماں ڈھلوں کے بیٹے عمر دین کی اولاد کے ساتھ ابا جی اور ماں جی کے بہت اچھے تعلقات تھے) کو آپس میں صلح اور اچھے تعلقات قائم رکھنے کی کوشش بھی جاری رکھی۔ اس وجہ سے گاماں ڈھلوں خاندان اور رشتہ دار میری بہت عزت کرتے ہیں۔

میرے بزرگوں خصوصاً ابا جی، ماں جی اور میرے بڑے بھائی صدیق کے مثالی تعلقات جو گاماں ڈھلوں کے خاندان کے ساتھ تھے اس کی وجہ سے میں بھی سب ڈھلوں خاندان کے افراد سے دلی لگاؤ رکھتا ہوں۔ میں خاص طور پر چوہدری گلزار، عمر خیام، عمر حیات، یونس، ڈاکٹر شفیق، کرنل رفیق ڈھلوں، شوکت، شمیم، غزالہ، یاسمین، کرنل طاہر اور آگے ان کے بچوں اور رشتہ داروں سے اچھے مراسم قائم کرنے میں کامیاب رہا۔

پاکستان پہنچنے کے بعد چوہدری جمال الدین کے کلار خاندان نے بہت مشکل اور تکلیف دہ وقت دیکھا۔ اب ان کے پاس چوہدری عطا محمد شہید جیسا کوئی مضبوط سہارہ نہیں تھا چوہدری جمال الدین (میرے ابا جی) اور راجن بی بی (میری ماں جی) الگ الگ جگہوں سے پاکستان داخل ہوئے اور دونوں کو ایک دوسرے کے

بارے میں کچھ علم نہیں تھا، دونوں کو یہی گمان تھا کہ شہید ہو گئے ہوں گے۔ اسی طرح ان دونوں کے بہن بھائی اور ان سب کی اولاد کو اور دوسرے رشتہ داروں کے بارے کچھ معلوم نہ تھا۔ تقریباً دو سال بعد اللہ تعالیٰ نے زندہ بچ جانے والے خاندان کے افراد کو آپس میں ملا دیا۔

ایک خوشحال گھرانے کے افراد انتہائی غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ چوہدری جمال الدین کلار اور راجن بی بی کے رشتے دار سوائے زمینداری کے کچھ اور کرنا نہیں جانتے تھے، اس لیے سب لوگوں نے شہروں سے دُور دیہاتوں میں بسنے کو ترجیح دی، بہت سے مہاجر خاندان بڑے شہروں لاہور فیصل آباد، ساہیوال۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ، گجرانوالہ اور سیالکوٹ وغیرہ میں آباد ہو گئے یہ زیادہ تر چھوٹے کسان یا بغیر زمینداری پیشہ (ان کو عرف عام میں کمی کہتے تھے جن میں نائی، تیلی، کمہار، لوہار اور ترکھان وغیرہ پیشہ کے لوگ تھے)۔ ایسے لوگ بہت فائدے میں رہے اور گراں قیمت جائدادیں اور کمرشل دکانیں جو ہندوؤں اور سکھوں نے چھوڑی تھیں ان لوگوں کو مل گئیں مگر جمال الدین کی فیملی مختلف دیہاتوں میں دھکے کھاتے رہے۔ ایک چھوٹے کسان کی حیثیت سے غربت مگر خودداری کی زندگی گزاری۔

❁❁❁

تیرھواں باب

ہجرت پاکستان کے کاروان کا اہم ترین کردار

راجن بی بی (میری ماں جی)

راجن بی بی چوہدری عطا محمد کی بہو اور جمال الدین (میرے ابا جی) کی زوجہ تھیں۔ جب پاکستان بنا تو ہجرت کے مشکل مراحل سے گزرنے کے بعد راجن بی بی اور فاطمہ عرف رلی (میری پھوپھی) اپنے اپنے بچوں کو لے کر مختلف جگہوں پر رہائش پذیر رہیں اور نو ماہ بعد جمال الدین کے پاس پہنچ گئیں۔ راجن بی بی نے ایک انتہائی مطمئن زندگی گزاری۔ وہ اپنی بچپن اور نوجوانی کے زمانے کی بیجا پور اور اکلاھے کی سکھ سہیلیوں کو بہت یاد کرتی تھیں۔ اپنے سسر (چوہدری عطا محمد) اور ساس (زینب) کو ہمیشہ بہت عزت سے یاد کرتی اور ان کی بہت تعریف کیا کرتی تھیں۔ چوہدری عطا محمد (سسر) اور زینب (ساس) کی بہت خدمت کی اور ان دونوں سے بہت دعائیں وصول کیں۔ چوہدری عطا محمد کا ایک بڑا خاندان تھا اور ان کے جاننے والے اور رشتہ داروں کا بہت زیادہ آنا جانا تھا ان سب کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کوئی آسان کام نہ ہوتا تھا۔ مگر راجن بی بی اپنی ساس زینب کے ساتھ مل کر ہمیشہ احسن طریقے سے سارے گھریلو معاملات سرانجام دیتیں۔

راجن بی بی کی طبیعت شادی سے پہلے لاپرواہی والی تھی مگر زینب نے اپنی بہو راجن بی بی کو ایک انتہائی سمجھدار اور سگھڑ عورت بنا دیا۔ راجن بی بی اپنی ساس زینب کی ہمیشہ تعریف کیا کرتی تھیں۔ اپنی اولاد اور خاندان کے لیے انہوں نے ہمیشہ بہت محنت کی۔ ماں جی نے ۱۹۸۵ء میں حج کا فریضہ ادا کیا۔ خاندان کے لوگ اور تمام

رشتہ دار ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ بہت خوش شکل ہنس مکھ اور خوش اخلاق عورت تھیں۔ ہمیشہ دوسروں کا بہت خیال کرتی تھیں۔ میری شادی میری ماں جی کی مرضی سے ہوئی اور شادی کے بعد ماں جی کو میں نے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کی۔ میں انتہائی خوش قسمت رہا کہ اللہ نے مجھے ماں جی اور ابا جی کی خدمت کرنے کا بھرپور موقعہ دیا۔ جمال الدین اور راجن بی بی صرف میرے لیے والدین ہی نہیں تھے، بلکہ میرے لیے میرا فخر اور رول ماڈل تھے۔ وہ آزادی پاکستان کے دو بے مثال کردار تھے۔ وہ اس راہ حق کے مجاہد اور غازی تھے۔ میں اس لحاظ سے بھی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے ماں جی اور ابا جی سے ان کی زندگی پر گزرے ہوئے واقعات بار بار سننے کا موقعہ ملا۔ اور ہمیشہ ان کی زندگی کے حقائق سن کر مجھے فخر محسوس ہوا کہ میں دنیا کے عظیم ترین والدین کی اولاد ہوں۔ میری رگوں میں جدوجہد آزادی پاکستان کے عظیم شہید دادا (عطا محمد) اور مجاہد و غازی والدین (جمال الدین اور راجن بی بی) کا خون ہے۔ یہ فخر میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔

راجن بی بی نے اپنے ۵ بیٹوں (محمد صدیق، خدا بخش، خورشید احمد، محمد یوسف اور محمد رفیق) اور ۴ بیٹیوں (صدیقاں بی بی، رحمت بی بی، سلامت بی بی اور رضیہ بی بی) کی انتہائی مشکل حالات میں بہت اچھی پرورش کی (ہم کل ۹ بہن بھائی تھے۔ بڑے بھائی محمد صدیق، بڑی آپا صدیقاں، دوسرے نمبر والی بہن رحمت بی بی اور مجھ سے بھی چھوٹی بہن رضیہ بی بی وفات پا چکے ہیں۔ اب ۴ بھائی اور ایک بہن یعنی ہم پانچ بہن بھائی ہیں)۔ راجن بی بی (میری ماں جی) نے خود فاقے کاٹے مگر اولاد کو اچھا کھلایا اور پہنایا۔ کیونکہ کتاب کا موضوع ہجرت پاکستان پر مرکوز ہے اس لیے شاید ماں جی کی باتیں اور یادیں بھرپور انداز میں بیان نہ کرسکوں ورنہ میری ساری عمر بھی ان کے کارناموں کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ میری آرمی آفیسر کی حیثیت سے جہاں بھی

تعیناتی ہوتی میری ماں جی کا ساتھ ہمیشہ ہوتا۔ میری نوکری کے دوران ماں جی ایبٹ آباد، سیالکوٹ، سبی بلوچستان، کھاریاں، ملتان، ٹھل، رزمک، راولپنڈی۔ اسلام آباد اور دیگر مقامات پر ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔ اس کے علاوہ سیر اور سیاحت کے لیے بہت سی جگہوں پر ماں جی میرے ساتھ گئیں۔ میں نے ماں جی کو مختلف ہتھیاروں کا فائر بھی کروایا۔ ماں جی میرے ساتھی فوجی آفیسرز اور ان کی بیگمات اور بچوں میں بہت ہر دلعزیز اور مشہور تھیں۔ سب لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ماں جی کو اپنی ساری اولاد اور اپنے تمام نواسے نواسیاں اور پوتے پوتیوں سے بہت پیار تھا۔ ان کو سب سے زیادہ پیار اپنے پوتے احمد بلال ٹیپو (میرا بیٹا) سے تھا۔

ماں جی بہت خوش اخلاق اور بہت ہنسی مذاق کرنے والی تھی۔ وہ پاکستان کی آزادی کے واقعات بہت شوق سے سنایا کرتی تھیں۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی میری ماں کا ساتھ تھا۔ ان کے بغیر میرا دل نہیں لگتا تھا۔ وہ کچھ باتوں پر مجھ سے ناراض بھی ہو جاتی تھیں، میں ہمیشہ ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ جب بھی ماں جی مجھ سے ناراض ہوتی تھیں میں ہمیشہ ان کو منا لیتا تھا۔ ان کو منانے کے لیے میں اکثر ان سے کوئی ایسا مذاق کرتا جس سے وہ ہنس پڑھتی اور مجھے گلے لگا کر معاف کر دیتی تھیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ماں جی مجھ سے ناراض ہو جاتی تو میں رات کو ان کو کافی دیر تک مناتا رہتا ان کے پاؤں دباتا رہتا اور ماں جی آخر مان جاتیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ماں جی ناراض ہوں اور میں ماں جی کو منائے بغیر اور معافی مانگے بغیر سو جاؤں۔ اور ماں جی بھی ہمیشہ مجھے معاف کر دیتیں۔ ماں جی کی ایک بہت اچھی اور انوکھی عادت تھی وہ گھر کے صحن میں بیٹھ کر چڑیوں کو روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالتی تو بہت سی چڑیاں ماں جی کے قریب اور ان کے کندھوں اور سر پر بیٹھ جاتی تھیں۔ جب کوئی اور قریب آتا تو وہ چڑیاں اڑ جاتیں۔ یہ منظر دیکھ کر لوگ حیران ہو جاتے تھے۔

ماں جی کو بکریاں پالنے اور سبزیاں اگانے کا بہت شوق تھا۔ وہ پنجیری بہت اچھی بناتی تھیں۔ ماں جی کے پاس بہت سی دیسی اشیاء کھانے پینے کے لیے ہوتی تھیں، اور جو بھی ملنے آتا ان کو کھانے کے لیے خوشی سے پیش کرتی تھیں۔

ماں جی کو انڈین پنجابی گانے خصوصاً گدا، بولیاں، سٹھنیاں اور شادی بیاہ کے گیت سننے کا بہت شوق تھا۔ وہ نعتیں بھی بہت شوق سے سنا کرتی تھیں۔ میں ماں جی کے ساتھ رہنے کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کبھی مجھے چھوڑ کر جائیں گی۔ دسمبر ۲۰۱۱ء میں ماں جی کو اچانک فالج ہو گیا۔ ڈاکٹرز کے مشورے سے سی ایم ایچ راولپنڈی میں داخل کروا دیا گیا۔ میں اپنی کیفیت شاید بیان نہ کر سکوں دل چاہتا تھا مجھ سے کوئی سب کچھ لے لے بس میری ماں جی صحت مند ہو کر اسی طرح خوش و خرم میرے ساتھ رہیں۔ مگر شاید اللہ میاں ان کو اپنی رحمت کے سایہ میں جلدی بلانا چاہ رہے تھے۔ ماں جی نے ۲۹ جنوری کو بولنا چھوڑ دیا اس سے پہلے میں روانہ صبح اذانوں کے وقت سی ایم ایچ (ہسپتال) ماں جی کے پاس پہنچ جاتا۔ نماز کے بعد ۱۰ بجے تک ماں جی کے پاس رہتا اور پھر دفتر جاتا اور جلدی واپس آ جاتا اور دن ۲ بجے سے رات ۱۰ بجے تک میرا وقت ماں جی کے پاس ہسپتال میں گزرتا۔ جب ماں جی نے بات کرنا چھوڑ دی میں گھنٹوں ماں جی کے ہاتھ پکڑ کے ان کے پاس بیٹھا رہتا۔ ماں جی اپنے ہاتھوں سے میرے ہاتھ آہستگی سے دباتی اور ہاتھوں کی حرارت سے مجھے روحانی تسکین تو ملتی مگر میں بے بس ہو کے اللہ سے ماں جی کے لیے دعا مانگتے مانگتے زارو قطار رو پڑتا۔ ایک بار جب میرے آنسو ماں جی کے ماتھے پر گرے تو اچانک ماں جی نے آنکھیں کھولیں اور میں ان کی آنکھوں کے قریب اپنا چہرہ کیا اور اپنی گالیں ماں جی کے ہونٹوں کے پاس کی ماں جی نے بہت آہستہ سے مجھے چوما۔ مجھے یوں لگا کہ ماں جی نے مجھے پیار کر کے تسلی دی اور چند لمحوں کے لیے مجھے ایک

روحانی سکون کا احساس ہوا۔

۳فروری کو میں ۱۲ بجے دوپہر تک ماں جی کے پاس رہا، اس دن ماں جی کے چہرے پر ایک سکون اور تازگی نظر آئی میری بیگم اور میری بہنیں بھی ماں جی کے پاس موجود تھیں۔ دوپہر تک میں ماں جی کے چہرے کا نور دیکھ کر کچھ مطمئن تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں جمعہ کی نماز پڑھ کے آتا ہوں اور آپ ماں جی کا خیال رکھنا۔قریب ہی ایک مسجد میں جہاں جمعہ کے صرف فرض پڑھے، جونہی باہر نکلا شاہینہ (میری بیوی) کا فون آیا کہ میں جلدی آ جاؤں۔ جونہی میں پہنچا ماں جی کی آنکھیں تھوڑی تھوڑی کھلی تھیں مجھے لگا ماں جی مجھے دیکھ رہی ہیں میں نے ماں جی کی آنکھیں چومیں اتنے میں ڈاکٹر معائنہ کے لیے آیا۔ معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ مجھے کچھ دیر کے لیے کوئی سمجھ نا آئی اچانک میری بیوی اور بہنوں نے رونا شروع کر دیا۔ میری آواز بند ہو گئی کچھ بولنا چاہا مگر نہ بول سکا۔ میری بڑی آپا نے مجھے گلے لگا کر زور سے چلا کر کہا رفیق بے بے اللہ کے پاس چلی گئی ہے (ماں جی کو سب بے بے کہتے تھے)۔

چند لمحوں بعد میرے حواس بحال ہوئے تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھے لگا ماں جی تو سکون سے اللہ کے پاس پہنچ گئی ہیں مگر میری جان نکل گئی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون کہنے کے بعد اپنے آپ کو سمجھایا کہ اللہ کی رضا ماننے کے علاوہ میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں۔

وہ ایک عظیم عورت تھیں۔خدا ترس با اخلاق، پرہیز گار، دوسروں کا بہت خیال رکھنے والی، صابر شاکر، ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنے والی، ایک انتہائی مطمئن اور خدا ترس اور نیک سیرت عورت تھی۔ میں اس عظیم عورت کو اپنی ماں کی حیثیت سے ہٹ کر ایک انسان کے طور پر دیکھوں تو پوری ایمانداری سے کہ سکتا ہوں کہ اس سے

عظیم عورت میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی۔ وہ دنیا میں سب کو خوشیاں دینے اور آسانیاں بانٹنے آئی تھیں۔ اور وہ یہ کام بخوبی سرانجام دے کے اپنے خالقِ حقیقی کے پاس واپس گئیں۔ اللہ تعالیٰ میری ماں جی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ آمین۔
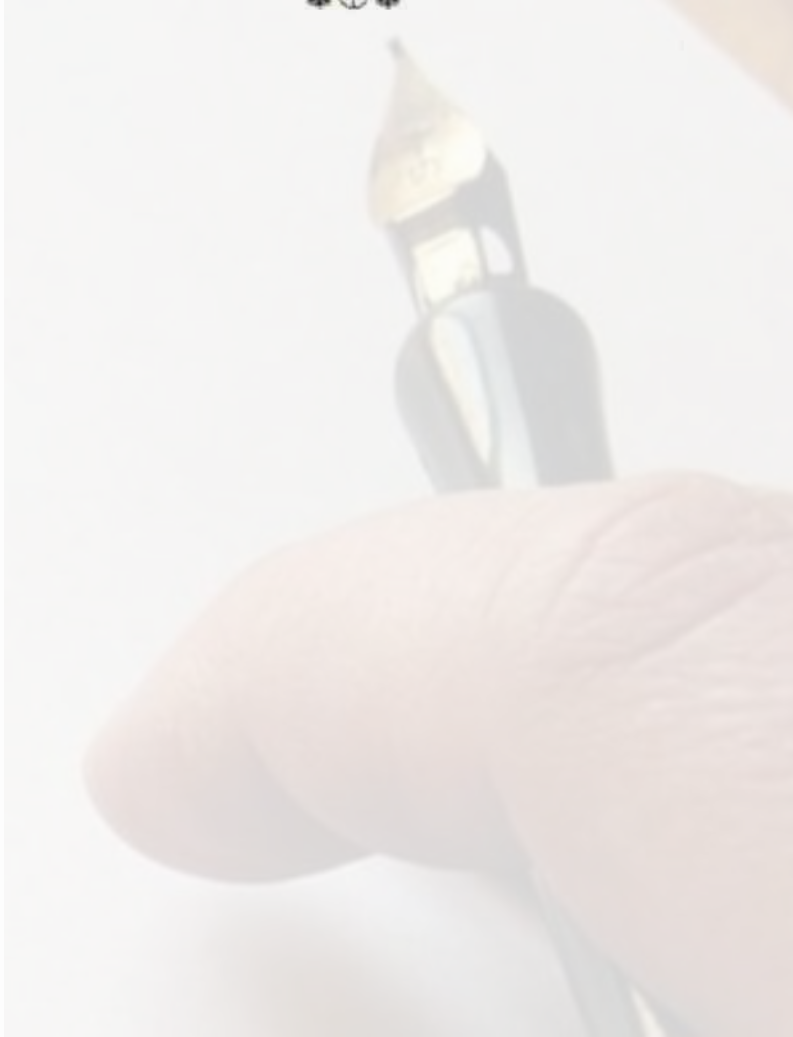
چودھواں باب

چوہدری جمال الدین کلار (میرے ابا جی) کی اولاد

(میں اور میرے بہن بھائی)

چوہدری جمال الدین اور راجن بی بی دوران ہجرت الگ الگ قافلوں میں مصائب و آلام جھیلتے ہوئے پاکستان آئے۔ان کا آپس میں ملاپ نو ماہ بعد ہوا۔ شروع میں چوہدری جمال الدین چک ۱۵۴ ج۔ب گٹی کموکہ تحصیل بھوانہ ضلع چنیوٹ میں رہائش پذیر ہوئے (اس وقت چنیوٹ ضلع جھنگ کی تحصیل تھی) ڈیڑھ سال بعد گزارہ سکیم کے تحت پاکستان گورنمنٹ نے چوہدری جمال الدین کو دس ایکڑ زمین چنیوٹ ہی کے ایک دوسرے گاؤں چک نمبر ۱۵۶ ج۔ب جنوبی ساہمل میں الاٹ کر دی۔ چوہدری جمال الدین اپنے خاندان کو لے کر چک ساہمل منتقل ہو گئے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اس وقت تک چوہدری جمال الدین کے دو بیٹے (محمد صدیق اور خدا بخش) اور ایک بیٹی (صدیقاں بی بی) تھی۔ چوہدری جمال الدین کے کل ۹ بیٹے بیٹیوں (۵ بیٹے اور ۴ بیٹیاں) میں سے محمد صدیق، صدیقہ بی بی، رحمت بی بی اور رضیہ بی بی اللہ کی رضا سے انتقال کر گئے اور خدا بخش، خورشید احمد، محمد یوسف، سلامت بی بی اور محمد رفیق (میں) کو ملا کر ۵ بہن بھائی ہیں۔ چوہدری جمال الدین کے ۹ بچوں میں سے سوائے میرے (مجھے میرے اللہ نے میرے والدین اور پیر رحیم اللہ شاہ صاحب کی دعاؤں سے اعلیٰ ترین علمی صلاحیت سے نوازا۔ جس پر میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے) کوئی خاص پڑھ لکھ نہ سکا، صرف محمد صدیق اور محمد یوسف پرائمری تک پڑھ سکے۔

محمد صدیق نے چک ساہمل سے پرائمری تعلیم حاصل کی۔ وہ پڑھائی میں بہت قابل تھا۔ ۱۹۶۴ء میں اس کی شادی خالہ زاد تاج بی بی عرف تاجاں سے ہوئی۔ تاجاں (میری بڑی بھابی) انتہائی شفیق اور اپنے بزرگوں ساس سسر کی بہت عزت کرتی تھی۔ محمد صدیق اور تاجاں کو اللہ نے بہت خوبصورت اولاد سے نوازا۔ ان کے کل سات بیٹے بیٹیاں تھے۔ مگر اللہ کی رضا کے آگے سب بے بس ہیں ان کے ساتوں بچوں کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ ان کے دو بیٹے عبدالغفار اور محمد لطیف ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۶ء میں پیدا ہوئے ان دونوں کا انتقال بالترتیب چھ اور سات سال کی عمر میں ہوا۔ باقی بچے عبداغفور، منیراں، صغراں، بھی چار، پانچ اور تین سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔ محمد صدیق کے دو مزید بچے بہت ہی کم عمر میں فوت ہو گئے۔ ۱۹۹۰ء میں تاجاں بی بی بھی فوت ہو گئی اور محمد صدیق اکیلا رہ گیا۔ وہ حضرت سلطان باہو کے معتقد تھے اور ان کی درگاہ باقاعدگی سے جایا کرتے تھے۔ ان کو شاہنامہ اسلام، ہیر وارث شاہ، میاں محمد بخش اور اور حضرت سلطان باھو کا کلام زیادہ تر زبانی یاد تھا۔ محمد صدیق نے دوسری شادی جمیلہ بیگم سے ۱۹۹۳ء میں کی۔ ان سے ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ جمیلہ کا انتقال بھی ۲۰۱۰ء میں ہو گیا۔ اس کے بعد بھی ایک اور نکاح کیا مگر جلد ہی طلاق ہو گئی۔ آخری عمر میں وہ بہت جذباتی اور حساس ہو گئے تھے۔ میں نے ہمیشہ ان کا بہت خیال رکھا اور ان کی اپنے والد کی طرح عزت کرتا تھا۔ میرے کئی بار اصرار کے باوجود وہ میرے ساتھ رہنے کو نہیں مانے۔ کیوں کہ ان کا دل کہیں اور نہیں لگتا تھا۔ باقی بھائیوں سے ان کی لڑائی رہتی تھی اور بھائی محمد صدیق کے ساتھ اچھا رویہ نہیں رکھتے تھے۔ مجھ سے مشورہ کر کے انہوں نے آخری سال آپاں صدیقاں کے بچوں علی اصغر وغیرہ کے پاس چک ۳۱۹ ج۔ب ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ میں گزارا۔ ان کا انتقال جنوری ۲۰۲۰ء میں ہو گیا۔ وفات کے وقت بھی ان کے بھائیوں (خدا بخش اور محمد یوسف) کا

رویہ انتہائی نامناسب تھا۔ ان کا بڑے بھائی کے ساتھ یہ نامناسب رویہ مجھے جب یاد آتا ہے تو میرا کلیجہ پھٹنے کو آجاتا ہے۔ اللہ کی ذات ان کو ہدایت دے اور معاف کر دے۔ محمد صدیق سخی دل اور دوستیاں نبھانے والا انسان تھا۔ ان کی وفات کا ان کے چاہنے والوں (میرے سمیت) بہت دکھ ہوا۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔

چوہدری جمال الدین کی بڑی بیٹی صدیقاں بی بی کی شادی چوہدری قائم دین عرف قیماں سے ۱۹۶۵ء میں ہوئی ان دونوں کی اولاد میں پانچ بیٹے علی گوہر، علی محمد، علی اکبر، علی اصغر اور علی رضا اور تین بیٹیاں پروین، نسرین اور کلثوم ہیں۔ سب کی شادیاں ہو گئیں ہیں اور سب ماشا اللہ اچھے انسان ہیں اور اپنا اچھا گزارہ چلا رہے ہیں۔ صدیقہ بی بی (میری بڑی آپا) بہت عقلمند، سلیقہ شعار، محنتی اور سب رشتے داروں کا خیال رکھنے والی عورت تھی۔ میں سکول کے زمانے میں ان کے اور ان بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ خصوصاً پروین اور علی گوہر میرے بہن بھائی کی طرح تھے۔ مجھے آپا اور ان کے شوہر چوہدری قائم دین سے خاص لگاؤ تھا۔ ان کے پاس گزارا ہوا وقت مجھے بہت یاد آتا ہے۔ صدیقاں بی بی اور قائم دین ایک بہت اچھی زندگی گزار کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ قائم دین کا انتقال ۲۰۱۰ء اور صدیقاں بی بی کا ۲۰۱۵ء میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔

چوہدری جمال الدین کی بیٹی رحمت بی بی کی شادی پھوپھی زاد عمر خیام سے ہوئی ان کی اولاد میں چار بیٹے محمد سلیم، محمد یونس، غضنفر علی اور محمد ندیم اور شبانہ، فرزانہ، ریحانہ، اور لائبہ چار بیٹیاں ہیں سب بچے شادی شدہ ہیں۔ محمد یونس سب بہن بھائیوں میں سے زیادہ کامیاب زندگی گزار رہا ہے۔ رحمت بی بی ایک ملنسار، با اخلاق اور خوش طبیعت عورت تھی۔ سارے بہن بھائیوں میں سے سب سے زیادہ ملنا

جلنا میرا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو میں ان کے پاس تھا۔ انتقال سے چند منٹ پہلے اس نے مجھ سے بہت پیار بھری باتیں کیں۔ اور مجھے کہا کہ رات میرے پاس گزارو۔ اچانک طبیعت خراب ہوئی اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ میں اس وقت ان کے پاس ہی تھا۔ ان کا انتقال ۲۰۱۷ء میں ۶۵ سال کی عمر میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔

چوہدری جمال الدین کی چھوٹی بیٹی رضیہ بی بی ۱۹۷۰ء میں پیدا ہوئی۔ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ اس نے سب گھر والوں کی خصوصاً میری بہت خدمت کی۔ ۱۹۸۷ء میں اس کی شادی پھوپھی اور ماموں زاد محمد اقبال سے ہوئی۔ وہ چک ۹۳ ج۔ب تحصیل گوجرہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بیاہ کے گئی تھی۔ اقبال نے کبھی بھی رضیہ کا اچھا خیال نہیں رکھا۔ بیماری کی حالت ۲۴ جولائی ۱۹۹۴ء میں انتقال کر گئی۔ رضیہ ایک بے مثال لڑکی تھی، انتہائی صابر، محنتی، خاموش طبیعت، اپنا غم اپنے دل میں چھپا کے رکھنے والی اور کبھی گلہ شکوہ نہ کرنے والی تھی۔ میں اس کی خدمت اور قربانیوں کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اس کی محبت اور خدمت کے بغیر میں شاید اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکتا۔ ہمیشہ میرے دل سے ان کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ رضیہ کی بڑی بیٹی نسیم اور بیٹا ساجد دونوں شادی شدہ ہیں۔ رضیہ کا ایک چھوٹا بیٹا عابد چھوٹی عمر میں ۱۹۹۳ء میں فوت ہو گیا تھا۔ اللہ کی ذات رضیہ کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور اس کے صبر اور قربانی کا اجر دے اور مجھے اللہ سے امید کامل ہے کہ وہ رضیہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں گے۔ انشااللہ آمین۔

خدا بخش (میرا بھائی) کی شادی پھوپھی زاد اور ماموں زاد تاج بی بی سے ۱۹۷۵ء میں ہوئی۔ خدا بخش نے فوج میں بطور سپاہی ۲۰ سال نوکری کی۔ ۱۹۸۷ء میں ریٹائرڈ ہو گئے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد چھوں سے پانچ ایکڑ زمین خریدی اور

زمینداری کے ساتھ ساتھ اور بھی کاروبار کرتے رہے۔ چک ۱۵۶ ج۔ب سا ہمل میں ہی آباد ہیں ان کی اولاد میں سات بچے (چھ بیٹے اور ایک بیٹی) ہیں۔ محمد شفیق عرف طالب (بیماری کی وجہ سے ۲۰۰۴ء میں وفات پا گیا)۔ محمد صابر، صابراں بی بی، محمد حسین، محمد حنیف، غلام حسین، محمد شریف اور غلام شبیر سب شادی شدہ ہیں۔ غلام حسین سادہ سا لڑکا ہے۔ اس کی بیوی طلاق کے بعد اپنا بچہ لے کر اپنے میکے چلی گئی۔

چوہدری جمال الدین کلار کا بیٹا محمد یوسف ۱۹۵۴ء میں پیدا ہوا اس کی شادی ۱۹۷۹ء میں حشمت بی بی عرف حسو سے ہوئی۔ یوسف کے تین بیٹے امجد حسین، محمد سلیم اور محمد جمیل اور دو بیٹیاں فاطمہ بی بی اور سلمٰی ہیں۔ اس کے علاوہ یوسف کے دو جڑواں بچے چند دنوں بعد ہی فوت ہو گئے تھے۔ یوسف کے سب بچوں کی شادیاں ہو گئی ہیں اور سب بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔

چوہدری جمال الدین کا درمیانہ بیٹا خورشید احمد ۱۹۵۱ء میں پیدا ہوا۔ ۱۹۷۹ء میں اس کی شادی جمیلہ سے ہوئی۔ خورشید کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ خورشید اور جمیلہ بد قسمتی سے ایک ساتھ زندگی نا گزار سکے۔ جمیلہ بچوں کو لے کر اپنے میکے چلی گئی۔ بچوں کی شادیاں ہو گئیں۔ خورشید بد قسمتی سے تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اور محمد صدیق کی طرح وہ بھی تنہا اپنا گزارا خود چلا رہا ہے۔

چوہدری جمال الدین کی بیٹی سلامت بی بی ۱۹۵۸ء میں پیدا ہوئی اور ۱۹۷۹ء میں اس کی شادی منظور احمد سے ہوئی۔ وہ اپنے گاؤں کے قریب تحصیلدار کے کھوہ پر رہتے ہیں۔ سلامتے اور منظور کے چھ بیٹے محمد اقبال، محمد عرفان، غلام حسین، غلام مصطفٰی۔ غلام مرتضٰی اور غلام عباس اور ایک بیٹی آمنہ بی بی ہے۔ ساتوں کی شادیاں ہو گئیں ہیں اور سب اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔

❁❁❁

پندرھواں باب

شہید باپ کا غازی بیٹا۔ چوہدری عطا محمد شہید کا بڑا بیٹا چوہدری جمال الدین کلار (میرے ابا جی)
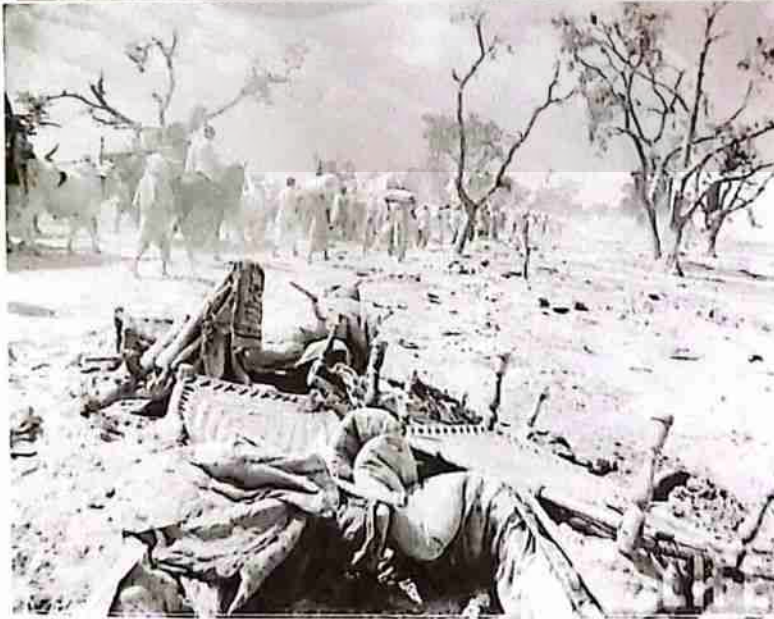
جس قافلے میں جمال الدین شامل ہو کر ہجرت کے لیے روانہ ہوئے اس قافلے کے زیادہ تر لوگ سکھوں کے مختلف حملوں میں شہید ہو گئے۔ جمال الدین اور ان کے ساتھی بارڈر پار کرنے سے پہلے ہی جدا ہو گئے۔ جمال الدین کے جسم پر دو جگہ گہرے زخم تھے، جو سکھوں کے حملے کے دوران بارڈر کراس کرتے وقت ان کو لگے۔ جمال الدین کو اپنے والد چوہدری عطا محمد اور اپنے بہن بھائیوں، بیوی بچوں اور دیگر عزیز واقارب کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ حالات کے مطابق زیادہ گمان یہی تھا کہ سب شہید ہو گئے ہوں گے، مگر اللہ سے امید کا سہارا ابھی بھی زندہ تھا۔ کسی نے جمال الدین کو مہاجر کیمپ پہنچا دیا۔ وہاں انتظامات اتنے خراب تھے بے کس و بے یارومددگار مہاجرین بھوکے پیاسے سردی سے ٹھٹھرتے کھلے آسمان کے نیچے مقامی لوگوں کی مدد سے زندہ تھے۔ لوگ بھوک سردی اور بیماری سے مر رہے تھے۔ تین دن بعد جمال الدین کلار اللہ کے سہارے کی تلاش میں مہاجر کیمپ سے نکل کر نا معلوم منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔ کہیں سے بھی کھانے کے لیے کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ ایک اتنے بڑے زمیندار کا بیٹا آج روٹی کے ایک ایک نوالے کو ترس رہا تھا۔ چند دن تک جمال الدین نے ندی نالوں کا پانی اور درختوں کے پتے، جڑی بوٹیاں کھا پی کر گزارا کیا۔

چند دنوں بعد جمال الدین لائل پور (فیصل آباد کا اس وقت نام لائل پور تھا) پہنچ گئے۔ گورنمنٹ کے کیمپ میں کچھ بہتر انتظامات تھے۔ چوہدری جمال الدین کلار

سے سوالات و جوابات کے بعد کچھ خالی دکانیں اور ایک بڑا مکان سرکاری اہل کاروں نے جمال الدین کو الاٹ کر دیا۔ چند دن وہاں بڑی مشکل سے گزارا کیا۔ اپنوں کی یاد اور سادہ زمیندارہ مزاج کی وجہ سے جمال الدین کوئی فیصلہ نہ کر پایا کہ کیا کرے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ بڑے زمینداروں کو گورنمنٹ زمینیں بھی دی رہی ہے۔

چند دنوں بعد چوہدری جمال الدین لائلپور کی دوکانیں اور مکان چھوڑ کر مغرب کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات کو ایک گاؤں کی مسجد میں چلے گئے۔ یہ چک نمبر ۱۵۴ ج۔ب گٹی کموکہ کا گاؤں تھا۔ یہ اس وقت تحصیل چنیوٹ اب ضلع چنیوٹ کا ایک درمیانہ آبادی والا گاؤں تھا۔ چنیوٹ کے علاقے کے لوگوں کو عرف عام میں جانگلی کہا جاتا تھا۔ فیصل آباد، لاہور اور باقی پنجاب کے لوگ اب بھی اس علاقہ کے رہنے والوں کو جانگلی کہتے ہیں۔ عشاء کی نماز کے وقت جمال الدین مسجد کی دیوار سے ٹیک لگا کر سو رہا تھا کہ کسی نے اس کو جھنجوڑ کر جگایا اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کو کہا۔

جمال الدین نے کہا کہ اس کے کپڑے پاک نہیں ہیں۔ گاؤں کے ایک بزرگ نے جمال الدین کو کہا کہ وہ اس کے گھر آ کے کھانا کھا سکتا ہے مگر جمال الدین نے کہا کہ میں مسجد میں نہا دھو کر صاف کپڑے پہن کر پھر آ جاؤں گا۔ نہا دھو کر جمال الدین نے مسجد ہی میں نیند پوری کی۔ صبح اذان کے وقت کسی نے جمال الدین کو باسی روٹی اور لسی کا گلاس لا کر دیا، جمال الدین یہ دیکھ کر رو پڑا کہ ایک بڑے زمیندار کی آج حالت فقیروں جیسی تھی۔ جمال الدین سجدے میں گر گیا۔ اللہ سے رو رو کر دعائیں مانگی۔ یا میرے مالک اے مالک دو جہاں میں اس بے بسی کی حالت میں بھی تیرا شکر ادا کرتا ہوں۔ دعا مانگتے ہوئے اللہ سے ایک منت مانی کہ ''اے اللہ اگر میں دوبارہ ایک گزارے لائق زندگی گزار سکوں مجھے میرے بیوی بچے بہن بھائی اور باقی بچھڑے ہوئے اپنے پیارے مل جائیں، تو میں زندگی بھر نماز نہیں چھوڑوں گا۔ قرآن پڑھوں گا،

روزے، زکوٰۃ اور صدقے خیرات اپنی حیثیت کے مطابق ادا کرتا رہوں گا۔ اللہ نے ان کی دعائیں سن لیں، چند مہینوں کے اندر اندر ان کے سب اہل خانہ اور قریبی رشتہ دار اور پیر صاحب مل گئے۔ گورنمنٹ نے دس ایکڑ زمین عارضی طور پر الاٹ کر دی۔

سب سے پہلے پیر سید رحیم اللہ شاہ صاحب ملے وہ خود جمال الدین کو تلاش کرتے کرتے ان کے پاس آ گئے۔ پیر صاحب نے چوہدری عطا محمد کے شہید ہونے کی پوری داستان سنائی۔ اللہ کے کرم سے ایک ایک کر کے سارے رشتے دار ان کو مل گئے، لوگ فرشتہ بن کے آتے اور بتاتے کہ آپ کا فلاں رشتے دار فلاں جگہ ہے۔ سب سے آخر میں ان کو ان کی بیوی راجن بی بی ملی۔ جمال الدین نے اپنی محنت اور ایمانداری سے زمین سے اچھی فصلیں اُگا کر اور صحت مند مویشی پال کر اپنا اور اپنے خاندان کا بہترین گزارا چلایا۔

چوہدری جمال ہمیشہ تہجد کے وقت بیدار ہوتے۔ گاؤں کی مسجد میں پانی بھرتے، مسجد کی صفائی کرتے اور تہجد پڑھ کے گھر والوں کو نماز کے لیے جگاتے۔ نماز فجر کے بعد بیلوں سے ہل چلاتے اور جس دن نہری پانی کی باری ہوتی اس دن فصلوں کو پانی دیتے۔ ان کی زوجہ یا کوئی بیٹی یا کبھی کوئی بہو ناشتہ کھیتوں میں لے کر جاتی۔ کبھی تازہ کبھی باسی روٹی اس کے ساتھ لسی، گھر کا اچار اور مکھن ہوتا۔ کبھی کبھی چائے ناشتے کے بعد پیا کرتے تھے۔ ظہر کی نماز سے پہلے دوپہر کا کھانا کھاتے۔ اگر سبزی سالن نہ ہوتا تو پیاز اور اچار سے ہی کھانا کھا لیتے تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد کچھ دیر آرام کرتے اور پھر جانورں کے لیے چارہ اور فصلوں سے گھاس کاٹ کر لاتے۔ عصر کے بعد جانوروں کے لیے چارہ (پٹھے) کترنے کی مشین پر مویشیوں کا چارہ تیار کرتے۔ پھر نہا کر کپڑے بدلتے، مغرب کی نماز کے فوراً بعد سب کے ساتھ اکٹھے نیچے زمین پر بیٹھ کھانا کھاتے۔ کھانا کھانے کے بعد دودھ شوق سے پیتے تھے۔ گھر والوں سے بات چیت اور مشورے کرتے۔ عشاء کی

نماز کے بعد کچھ دیر اپنے دوستوں سے گپ شپ لگاتے۔ گرمیوں میں مکانوں کی چھت پر سوتے سردیوں میں ویرانڈے میں سوتے۔ رات کو دو سے تین دفعہ جاگ کر مویشیوں کو دیکھتے۔ مویشیوں کے کھانے پینے اور آرام کا بہت خیال رکھتے تھے۔

جمال الدین کلار کی بہت سی اچھی عادات تھیں۔ وہ ہر جمعہ کے دن چاول، حلوہ یا کوئی بھی کھانا تیار کروا کے تقسیم کرتے۔ چوہدری جمال پڑھے لکھے نہیں تھے مگر انہوں نے اللہ سے منت مانی ہوئی تھی اور کافی زیادہ قرآن زبانی یاد کیا۔ وہ زبانی قرآن پڑھتے رہتے تھے۔ ان کا قرآن پڑھنے کا تلفظ بہت اچھا تھا۔ ان کی چھوٹی بہو شاہینہ (میری بیوی) کو چوہدری جمال (اپنے سسر) کا قرآن پڑھنے کا انداز اور تلفظ بہت پسند تھا۔ چوہدری جمال کو پنجابی گانے، کہاوتیں اور کہانیاں بہت پسند تھیں۔ جگے جٹ کے قصے، پنجابی کی بجھارتیں اور لوک داستانیں بہت شوق سے سنایا کرتے تھے۔ بیجا پورا کلاھے اور ملیر کوٹلہ کے اپنے دوست سکھوں کو بہت یاد کرتے اور ان کی اکثر باتیں کرتے رہتے تھے۔ اپنے خاندان اور رشتہ داروں کے ہمیشہ کام آتے اور ہر غمی اور خوشی میں شریک ہوتے۔ تمام رشتہ داروں کے ساتھ ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ گاؤں کے تمام لوگ جمال کلار کی بہت عزت کرتے تھے وہ بھی سب سے بہت اچھا تعلق رکھتے تھے۔ ان کی سب سے زیادہ دوستی گاؤں کے امام مسجد میاں عطاء اللہ سے تھی۔ اس کے علاوہ گاؤں کے معززین استاد لال خان، عطاء محمد آرائیں، منشی غلام نبی احمد ساہمل، نصرت ساہمل۔ احمد ترکھان، رمضان ترکھان، ملہ ساہمل، اللہ دین گھسن، خادم حسین آرائیں اور حافظ محمد بخش سے چوہدری جمال الدین کو خاص لگاؤ تھا۔

اپنے سارے رشتہ داروں سے بہت اچھے تعلق رکھتے تھے، اپنی بڑی بہن فاطمہ عرف رلی کے شوہر غلام محمد، اپنے سالے چوہدری کرم بخش، اپنے چھوٹے بہنوئی فتح محمد، اپنے بڑے داماد قائم دین عرف قیماں سے دلی لگاؤ تھا اور ان سب سے جمال

الدین کا مثالی تعلق تھا۔

بارہ ربیع الاول، دس محرم، اکیس رمضان (یوم شہادت حضرت علی کرم اللہ وجہہ) شب برات، شب معراج، جمعہ الوداع اور یوم حج خصوصی اہتمام سے منایا کرتے تھے۔ باقاعدگی سے گیارہویں شریف کا ختم اور بڑی گیارہویں خصوصی عقیدت سے مناتے۔

مہمانوں کا بہت خیال رکھتے۔ وہ خوش خوراک تھے اور اچھا کھانا شوق سے کھاتے۔ سفید کپڑے، تُلّے والی پگ اور چمڑے کا کھسہ بہت شوق سے پہنتے تھے۔ طبیعت غصہ والی تھی مگر دل کے بہت نرم اور سخی انسان تھے۔ میری شادی کے بعد جب مجھے سیالکوٹ میں سرکاری گھر ملا تو میری دلی خواہش تھی کہ اپنی ماں جی (راجن بی بی) اور ابا جی (چوہدری جمال الدین) کو گاؤں سے اپنے پاس سرکاری گھر لے کر آؤں۔ دونوں کو بڑی مشکل سے تیار کیا اور میری خوش قسمتی تھی کہ ابا جی اور ماں جی میرے پاس رہنے کو تیار ہوئے۔ وہ چند سال میری زندگی کا سب سے سنہرا دور تھا کہ میرے محسن اور شفیق والدین میرے ساتھ تھے۔ جب پہلے دن میرے والدین سیالکوٹ میرے پاس آئے تو میں نے اپنی بیوی شانی کو پیار سے سمجھایا اور دل سے درخواست کی کہ وہ میرے والدین کا بہت خیال رکھے۔ شانی نے میرے والدین کا بہت خیال رکھا اور یہ میری بیوی کا مجھ پر ایک احسان تھا جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اور اللہ شانی کو اس کی جزا دے۔ آمین۔

میرے ابا جی (چوہدری جمال الدین کلار) ایک دفعہ بیمار ہوئے تو میں ان کو سی ایم ایچ سیالکوٹ لے گیا، ابا جی نے اس سے پہلے پوری زندگی کبھی کوئی ایلو پیتھک دوائی نہیں لی تھی۔ میں اس وقت کیپٹن تھا۔ میں ابا جی کو آفیسرز ویٹنگ روم میں بٹھا کر ان کے سیمپل جمع کروانے چلا گیا۔ واپس آیا تو ابا جی وہاں نہیں تھے، تلاش کرنے پر باہر لان میں گھاس پر بیٹھے نظر آئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ابا جی

یہاں کیوں آ گئے آپ کو میں نے صوفے پر بٹھایا تھا۔ ابا جی نے مجھے بتایا کہ ایک فوجی نے مجھے کہا کہ آپ اس صوفے سے اُٹھ کے دوسری طرف بیٹھ جائیں میں ان کو دوبارہ وہاں لے گیا تو ایک بریگیڈیئر وہاں اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھے تھے ابا جی اور میں سامنے صوفہ پر بیٹھے تھے تو ابا جی نے کہا اس فوجی (بریگیڈیئر) نے مجھے کہا تھا کہ دوسری جگہ بیٹھ جاؤں۔ میں نے کھڑے ہو کر سیلوٹ کیا اور اس بریگیڈیئر کو یوں مخاطب کیا: ''ایکسکیوز می سر! آپ نے میرے والد صاحب کو یہاں سے اٹھنے کو کیوں کہا؟'' اس نے حیرانی اور غصے سے مجھے دیکھا اور کہا کہ ''پھر کیا ہوا۔ میں اور میری فیملی یہاں بیٹھ گئے اور آپ کے والد دوسری جگہ بیٹھ جاتے۔''

مجھے اس سے زیادہ غصہ کبھی نہیں آیا ہوگا۔اس کی فیملی کا خیال کرتے ہوئے میں نے کہا سر پلیز ایک سائیڈ پر ہو کر میری بات سن لیں۔ باہر لان میں آئے اور میں نے غصے میں شاید کچھ زیادہ کہہ گیا۔میں نے کہا: ''سر پلیز! عزت کرنا اور کروانا سیکھیں میں اپنے والد صاحب کے ساتھ کسی کی بھی بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ کی جرأت کیسے ہوئی کہ آپ میرے والد صاحب کو صوفے سے اٹھنے کا کہیں،'' میری اُونچی آواز سن کے کچھ آفیسر وہاں آئے اور ابا جی بھی ادھر آ گئے، ابا جی نے مجھے مخاطب کر کیا خوبصورت بات کی کہ ''غصہ ختم کر و وہ تم سے بڑا ہے۔ ہر باپ تیرے جیسا غیرت مند بیٹا پیدا نہیں کر سکتا۔'' ابا جی کے منہ سے نکلا فقرہ میری زندگی کا اثاثہ ہے اور مجھے بہت فخر ہے کہ ابا جی کو میں پسند تھا۔ دو دن بعد بریگیڈیئر اپنی مسز کے ساتھ میرے گھر آئے ابا جی سے معذرت کی اور مجھ سے سوری بولا اور مجھ سے کہا کہ یور فادر از دی گریٹ مین۔ میں نے کہا یس ''آف کورس، دیٹس وائی آئی ایم پراوڈ آف مائی فادر''۔

ابا جی کافی کمزور ہو گئے تھے میں ان کا بے حد خیال کرتا۔ میں ان کو خود نہلاتا، جمعہ کو وہ ہمیشہ نہا کر اچھے کپڑے پہنتے۔ میں ان کو خود کپڑے پہناتا۔ ابا جی کی

خدمت کر کے مجھے دلی سکون ملتا۔ میں ان کے جسم کی صفائی (انڈر شیو وغیرہ) خود کرتا اور مجھے ہمیشہ ان کا کام کر کے ایک روحانی تسکین ملتی۔ ان کے چاہنے والے اس بات پر کامل یقین رکھتے تھے کہ وہ ایک ولی کامل تھے۔ ان کے ناخن کاٹتا تو وہ کاٹنے سے پہلے ہی اوہو کرتے تو میں مزاق کرتا کہ ابا جی ابھی تو میں نے ناخن ٹچ بھی نہیں کیے اس پر وہ بھی ہنس پڑھتے۔ مجھے ابا جی کی بہت سی باتیں یاد آتی ہیں۔ وہ باہر سوتے تھے گرمی اور مچھر بہت زیادہ تھے۔ میں نے ان کے لیے اے سی کا بندو بست کیا۔ میں نے ابا جی کو اندر کمرے میں سونے کے لیے اصرار کیا، وہ نہیں مانے انہوں نے کہا کہ میں اندر نہیں سو سکتا کیونکہ وہ ہمیشہ باہر سونے کے عادی تھے۔ ایک بار غصے سے انہوں نے مجھے جو کچھ کہا وہ میرے لیے نا قابلِ فراموش نصیحت بن گئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم لوگ زندہ اور مردہ برابر ہو، ہر وقت اندر رہتے ہو جیسے انسان قبر میں ہوتا ہے اسے نہ درخت نہ پرندے، نہ سورج طلوع ہوتا ہوا نہ بادل نہ دھوپ نہ چھاؤں کچھ نظر نہیں آتا۔ اس زندگی اور قبر کی زندگی میں کیا فرق ہے؟ وہ ایک درویش، صوفی اور اللہ کا خاص بندہ تھا اسے اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ تھا۔

۱۹۹۹ء میں میری پوسٹنگ جھل مگسی بلوچستان ہوگئی اور کچھ مہینوں سے ماں جی اور ابا جی گاؤں میں تھے۔ میری دونوں بہنیں آپا صدیقاں اور سلامت بی بی باری باری والدین کے پاس ہوتی تھیں۔ ۱۶ جولائی کو صبح صبح مجھے ماں جی کا فون آیا اور انہوں نے قیامت خیز اطلاع دی کہ میرے ابا جی اس دنیائے فانی سے جوارِ رحمت میں چلے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر فون آیا بھائیوں نے مجھ سے مشورہ کیا میں نے کہا کہ شام تک پہنچ جاؤں گا۔ میرے ساتھی دوستوں نے میری بہت مدد کی گاڑی اور ڈرائیور کا بندوبست کیا۔ بہت کوشش کے باوجود میں وقت پر نہ پہنچ سکا۔ گھر والوں کو راستے میں فون کر کے جنازہ پڑھانے کا کہ دیا۔ مگر میرا انتظار شاید ابا جی کو بھی تھا۔ رات ۹ بجے

پہنچا۔ ابا جی کا نورانی چہرہ اقدس دیکھا۔ رات کو ابا جی کی قبر مبارک سے لپٹ کر روتا رہا اور ان کی کہی ہوئی باتیں ان سے ہی کرتا رہا۔ میری باتیں ختم نہ ہوئیں مگر رات ختم ہونے لگی۔ ''گلاں مکیاں نہ ماہی نال میریاں تے ربا تیری رات مک گئی۔'' جنازے پر اعلان کیا گیا کہ چوہدری جمال الدین کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو تو ان کا بیٹا محمد رفیق ادھر موجود ہیں ان سے مانگ سکتے ہیں وہ ادا کریں گے۔ اگلے چند دنوں میں تقریباً ۲۰ سے زائد گاؤں کے لوگوں اور کچھ رشتے دار لوگوں نے مجھے بتایا کہ چوہدری جمال الدین نے ہماری مالی مدد کی مگر ہم اس کے پیسے اس کو لوٹا نہ سکے۔ چوہدری جمال ایک غریب مگر دنیا کا امیر ترین شخص تھا جس نے بے شمار لوگوں کی مدد کی۔ قل شریف کے ختم مبارک پر بھی بہت لوگ آئے مجھے گلے مل کہ تعزیت کرتے رہے۔

ابا جی کی نصیحتیں میری ہمیشہ راہنمائی کرتی ہیں وہ میرے باپ بھی تھے اور میرے مرشد بھی تھے۔ صبح نماز پڑھ کے میں جب واک کرتا ہوں اور سورج طلوع ہوتا دیکھتا ہوں تو اللہ کی شان اور ابا جی کی یاد مجھے روحانی سکون دیتی ہے۔ میری جب بیٹی پیدا ہوئی تو میری مسز نے ابا جی سے پوچھا کہ اس کا نام نور رکھ لیں۔ ابا جی نے کہا نور کے ساتھ زینب لگا دو تو بیٹی کا نام نور زینب رکھا گیا۔ بیٹے کا نام ابا جی نے احمد بلال رکھا میں نے ابا جی کی اجازت سے احمد بلال ٹیپو رکھا۔ ابا جی آپ میرے سب کچھ ہیں آپ میرے پاس ہیں۔ آپ کے ان گنت احسانات ہیں مجھ پر۔ اللہ تعالیٰ میرے ابا جی (چوہدری جمال الدین کلار) کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور اپنی قربت خاص میں جگہ دے اور ان کی پاکستان اور اپنے خاندان کے لیے دی گئی قربانیوں کا اجر عظیم عطا کرے۔ آمین۔

❀❀❀

اختتامیہ

اس کتاب میں ایک کلار جٹ خاندان کے بارے میں زیادہ تر ان حقائق کا احاطہ کیا گیا جن کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ آزادی پاکستان سے منسلک کرداروں سے ہے۔ بیان کیے گئے واقعات مصنف کی صرف جمع کردہ معلومات تک محدود ہیں، بے شمار ایسے واقعات ہوں گے جن کو عملی طور پر سہنے کے بعد بہت سے لوگ اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہوں گے اور ان کے ساتھ ہی وہ ان کہی ان سنی داستان بن گئے ہیں۔ بیان کردہ واقعات ان حالات کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں جو آزاد وطن پاکستان کے متلاشیوں نے دیکھے ہوں گے۔ قارئین کو اس بات کا احساس ضرور ہو گا کہ ایک خوشحال گھرانے کے لوگوں کے لیے اپنے گھر بار اور آسودہ زندگی کو چھوڑ کر ایک مفلسی کی زندگی کا انتخاب کرنا کتنا مشکل فیصلہ ہو گا۔ چوہدری عطا محمد شہید جیسے نہ جانے کتنے گمنام ہیروز ہوں گے جنہوں نے اپنے خون سے گلشن پاکستان کی آبیاری کی ہو گی۔ میری اپنے والدین اور دادا سے بے پناہ محبت صرف فطری اور خونی رشتے ہی کی وجہ سے نہیں، ان سے میرا روحانی عشق ان کی بے مثال خدمات (جو کسی سطح پر بھی نہ سراہی گئیں اور نہ کسی عہدہ دار کے علم میں لائی گئیں) کی وجہ سے ہے جو انہوں

نے بغیر کسی لالچ اور مطالبے کے ایک آزاد وطن میں اپنی آئندہ نسلوں کو آباد کرنے کے لیے دی ہیں۔ یہ کتاب کلار خاندان کے درویش انسانوں کی سادگی اور سخاوت سے بھرپور زندگیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب میں روحانیت اور طریقت کے ایک عملی راستے کا احاطہ کیا گیا ہے جو ایک عظیم ہستی فاطمہ عرف فطی نے اپنی اولاد کو دِکھایا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ کتاب کو مکمل پڑھیں اور اس میں منعکس کیے گئے سچے واقعات نوجوان نسل کو ضرور بتائیں اور پڑھائیں اس سے یقیناً ان کے دلوں میں وطن عزیز پاکستان کی محبت پیدا ہوگی اور اس محبت کی کمی مجھے اپنی نوجوان نسل میں محسوس ہوتی ہے۔ سب قارئین سے دست بدستہ التماس ہے کہ میرے اور میرے خاندان کے لیے دعا ضرور کریں اور میری دعا ہے کہ میری اس کاوش کو اللہ میرے لیے باعث رحمت بنا دے۔ آمین۔

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر محمد رفیق، تمغۂ امتیاز ملٹری، ریٹائرڈ آرمی آفیسر ہیں۔ انہوں نے انٹرنیشنل ریلیشنز میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔ اسلامک سٹڈیز، ہسٹری اور میڈیا سائنسز میں ماسٹرز ڈگری کے ساتھ ساتھ میڈیا سائنسز میں ایم فل کی ڈگری بھی حاصل کی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے عربی زبان میں ڈپلومہ اور کئی دیگر کورسز کر رکھے ہیں۔ مصنف ریسرچ اور پبلیکیشن کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں اور گزشتہ تیس سالوں میں انتہائی اہم عہدوں پر خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ ملک کی دفاعی افواج میں مصروف ترین پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ترین علمی اور تحقیقی صلاحیت حاصل کر لینا مصنف پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام اور عطا کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں مصنف کی کئی سالوں کی ریسرچ، محنت اور ذاتی دلچسپی شامل ہے۔ مصنف ایک سچے پاکستانی ہیں۔ ان کی اس کتاب میں ایک جٹ (کلار) خاندان کے دل ہلا دینے والے سچے واقعات قلمبند کئے گئے ہیں جو کہ یقیناً بہت سے لوگوں کے لیے دلچسپ اور سبق آموز ہوں گے۔ رب العالمین مصنف کی اس کاوش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر محمد رفیق

(تمغۂ امتیاز ملٹری)

sareer_publications
sareerpublications@gmail.com
www.sareerpublications.com